جلد 6 شمارہ 7 ستمبر 2004ء رجب 1425ھ

قد افلح من تزکی ○ وذکر اسم ربہ فصلی ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

CPL No. 49

Registerd

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض ومقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا۔
- کشف وکرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب وعرفان اور اسکی رضا ولقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔

موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔

- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل وعیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے ان کے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ماہنامہ گوجرانوالہ
آدمیت فلاح
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

جلد 6 شمارہ 7 ستمبر 2004ء رجب 1425ھ

ایڈیٹر وحید احمد

مجلس ادارت

محمد مرتضیٰ توحیدی، ایم محمد اکرم، پروفیسر منیر احمد لودھی، ایم محمد طالب
ڈاکٹر عبدالرشید وقار، محمد صدیق، سید عاشق حسنین مرتضیٰ شاہ بخاری
مولانا حافظ بشیر احمد

قیمت ———— -/20 روپے　　سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:0431-862835
Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
اداریہ	وحید احمد	1
خطبہ حجتہ الوداع	صدرالدین	3
اسلامی نظام عدل نفاذ میں مشکلات اور حل	مولانا سید محمد متین ہاشمی	10
اقبال کا تصور خودی	مرسلہ سید رحمت اللہ شاہ	15
اختلافی مسائل اوران کا نقطہ عدل	صدرالدین اصلاحی	22
پاکستانی ثقافت	مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری	30
مغرب نے عورت کو کیا دیا	سید جلال الدین عمری	38
کیا پاکستان میں سچائی کمیشن کا قیام ممکن ہے	کے ایم اعظم	42
آثار قدیمہ میں طوفان نوح کے ثبوت	ہارون یحیٰی	50

اداریہ

جو اقوام اختراعات و ایجادات، تحقیق و ترقی کا عمل جاری رکھتی ہیں انہیں غلامی کی زنجیریں نہیں پہنائی جا سکتیں۔ اگر صنعت پر غیر مسلموں کی اجارہ داری ہوگی تو اسلحہ میں بھی مسلمان محتاج ہونگے اور مالی لحاظ سے بھی ان کے دست نگر رہیں گے۔ اس طرح غیر مسلم اقوام اپنی من مانی کریں گی۔ دنیا کی تجارت ان کے ہاتھ میں ہوگی تو مسلم معیشت کمزور ہوگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

''مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعے جہاد کرو''۔ (ابو داؤد)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کو معاشی، صنعتی، اور جنگی لحاظ سے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے اقدامات کئے۔

مالی و جانی جہاد کے لئے اقتصادی حیثیت کا مستحکم ہونا ضروری ہے اور اقتصادی حیثیت کے استحکام کے لئے قومی اور بین الاقوامی صنعت و تجارت میں اہم حصہ حاصل کئے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا تجارت کو فروغ دینے کے اقدامات ضروری ہیں۔ صنعت سازی کو وسعت دینا، اسے عالمی معیار کے مطابق بنانا اور سائنس و ٹیکنالوجی کو فروغ دینا بھی ضروری ہے۔ تحقیق، اختراعات و ایجادات کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی بھی لازمی ہے۔ مالی قوت ایسی ہو کہ ایک طرف تو بے روزگاری دور ہو تو دوسری جانب مالی قوت اسلام کی تبلیغ میں مدد و معاون ثابت ہو۔ مالی قوت کمزور ہوگی تو مالی جہاد مشکل ہو جائے گا۔ جان سے جہاد کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ جدید اسلحہ تیار کیا جائے۔ جدید سے جدید اسلحہ بنانے میں اعلیٰ سے اعلیٰ مہارت حاصل کی جائے اور ایسی قوت حاصل ہو کہ دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ اسی طرح زبانوں سے، قلم سے، علم کے ذریعے جہاد کیا جائے۔ اپنے علم کو، بالخصوص تخلیق کائنات کے بارے میں علم کو بڑھایا جائے۔ یقیناً مالی، جانی اور علمی جہاد کرنے

والوں کا رتبہ بہت بلند ہے۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مسلم دنیا نے اختراعات وایجادات، صنعتی تحقیق وترقی اور سائنسی ترقی میں دلچسپی لی جس کی وجہ سے انہوں نے ایجادات بھی کیں اور سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے دیگر اقوام کی صنعت وسائنس سے فائدہ اٹھایا اور پھر اسے خود ترقی دی۔ لیکن جب انہوں نے اختراعات سے پہلو تہی اختیار کی تو ان کے معاشی وسیاسی زوال کا آغاز ہوا اور دن بدن بڑھتا گیا۔ جب یورپ ترقی کرر ہا تھا اور وہاں آئے دن نئی نئی صنعتی اختراعات وایجادات ہو رہی تھیں تو مسلم دنیا کی اس وقت کی حکومتیں، بالخصوص ترکی کے عثمان ترک اور ہندوستان کے مغل بادشاہ ان ترقیوں کے نتائج کا ادراک نہ کر سکے۔ انہوں نے اختراعات سے پہلو تہی کا رویہ اختیار کیا۔

موجودہ دور میں مسلمان دنیا کا مقابلہ صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب یہ اس قابل ہوں کہ یہ مالی، عملی اور صنعتی لحاظ سے غیروں کے محتاج نہ ہوں۔

والسلام

وحید احمد

خطبہ حجة الوداع

صدرالدین

نسلی برتری وفضیلت

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ترجمہ: "اے آدم کے فرزندو تمہیں علم ہے خدا نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر ضروریات پیش آمدہ کے باعث تم زمین کے مختلف حصص میں پھیل گئے۔ اور جغرافیائی موسمی اختلاف کی وجہ سے تم علیحدہ علیحدہ قبائل کی شکل میں زندگی بسر کرنے لگے۔ پہاڑی علاقہ کے لوگوں میں میدان کے بسنے والوں سے مختلف عادات پیدا ہوئیں۔ سمندروں میں رہنے والے یا سمندر کے ساحلوں کے قریب رہنے والوں کے خصائل ان لوگوں سے مختلف ہو گئے۔ جو خطوں کے وسط میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی طرح مشرق و مغرب کے مختلف موسموں نے رنگ کا اختلاف پیدا کر دیا۔ ان ملکوں کے لوگوں کے جہاں رنگ مختلف ہو گئے۔ وہاں ان کی بولیاں بھی مختلف ہو گئیں۔ لیکن یاد رکھو تم سب آدم کے فرزند ہو اور یاد رکھو تم سب کی فطرت ایک ہے۔ جلد کے مختلف رنگوں اور بولی کے اختلافات کے باوجود انسان کے ذہنی قوی اور اس کی فطرت یکساں ہے۔ رنگ کا اختلاف یا بولی (لون ولسان) کا اختلاف یا مشرق و مغرب کا سوال فطرت انسانی کی وحدت پر اثر پذیر نہ ہوسکا۔ فطرت ایک ہی رہی۔

فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله

خدا کی عطا کردہ فطرت انسانی ایک ایسی حقیقت ہے۔ کہ اس کو کوئی ماحول تبدیل نہیں کر سکتا۔ رہا فضیلت کا سوال۔ یاد رکھو فضیلت کے لئے دائم و قائم رہنے والا قانون یہ ہے۔ **ان اکرمکم عندالله اتقاکم** ۔سب سے مکرم فرد اور سب سے مکرم قوم وہ ہے جو خدا کی نگاہ میں سب سے زیادہ خدا خوف اور سب سے زیادہ اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کرتی ہو۔ نہ اہل عرب ہونا فضیلت کا موجب ہے۔ اور نہ اس کا عربی یا فارسی یا ہندی ہونا موجب فخر ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے جو بھی خدا خوف اور نیک عمل ہو وہ قابل تعظیم و تکریم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ

نہایت معقول اور ہمہ گیر ہے۔ وہ پیغامبر جس کو دنیا کی تمام اقوام کی اصلاح و تربیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ جس طرح نسلی فضیلت کا نظریہ مضر اور قابل اصلاح ہے اسی طرح رنگ اور بولی پر فخر کرنے کا نظریہ مضر اور قابل اصلاح ہے۔

ومن آیاتہ خلق السمٰوات والارض و اختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالک لأیات للعالمین

ترجمہ: ''اہل علم کے لئے زمین و آسمان کی تخلیق میں اور لوگوں کی بولیوں اور رنگوں کے اختلاف میں خدا تعالیٰ کی قدرت کے نشانات نظر آتے ہیں۔ اور یقیناً اہل علم کو ان اختلافات میں خدا تعالیٰ کی مصلحت نظر آتی ہے''۔

اس کائنات میں اس قدر اختلافات ہیں، کہ ان کا احاطہ کرنا محال ہے۔ ان وسیع اختلافات کے باوجود کائنات میں یکجہتی یگانگت اور تعاون پایا جاتا ہے۔ اور یہ تعاون بہت بڑے منافع اور طرح طرح کی برکات کا موجب ہے۔ یہ مشاہدہ اہل علم کو مجبور کرتا ہے، کہ وہ یقین کریں کہ اس وسیع و عریض کائنات کا بادشاہ عظیم قدرت اور عظیم حکمت کا مالک ہے جس نے لاتعداد اختلافات کے ہوتے ہوئے کائنات میں ایسا رابطہ و اتحاد قائم کر رکھا ہے جو بے شمار برکات کا موجب اور اہل علم کے لئے چشمہ عرفان و معرفت ہے۔ اہل علم کا یہ وصف خدا تعالیٰ نے بھی بیان فرمایا ہے۔

یتفکرون فی خلق السمٰوت والارض

وہ لوگ آسمان و زمین یعنی کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کر کے عرفان کی بے بہا دولت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

جس طرح سے بولیوں اور رنگوں کا ذکر کیا ہے اس طرح اہل مغرب و اہل مشرق کے اختلافات کا ذکر بھی کیا ہے فرمایا۔

رب المشرق و رب المغرب لا اله الا هو فاتخذه وکیلا

خدا تعالیٰ جو اہل مشرق کی تربیت و نشو و نما کرتا ہے اہل مغرب کی تربیت و نشو و نما کا اہتمام بھی کرتا ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسرا خالق اور ربوبیت کرنے والا نہیں ہے اس لئے اسکو اپنا کارساز بناؤ اس مضمون کو ان الفاظ میں بھی دھرایا گیا ہے۔

ولله المشرق والمغرب اہل مشرق اور اہل مغرب خدا کی مخلوق ہیں اور اس کے تصرف میں ہیں اس نے دونوں کو جسمانی و روحانی قوئی عطا کر رکھے ہیں اور دونوں کی استعدادوں کی ربوبیت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اسی لئے دونوں میں با اخلاق اور عالم فاضل شخصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اندریں حالات ایک دوسرے کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھنا غیر معقول اور غیر مفید ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لا یسخر قوم من قوم کوئی قوم دوسری قوم کو حقیر سمجھ کر اس کا تمسخر نہ اڑائے۔ **عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم** ہوسکتا ہے کہ جن سے نفرت کی جاتی ہے وہ نفرت کرنے والوں سے بہتر ہوں۔

خطبہ حجۃ الوداع

حجۃ الوداع میں دیگر امور کے علاوہ حضور سرور کائنات فخر موجوداتﷺ نے اقوام عالم کو یہ سبق دیا کہ کوئی یہ دعویٰ نہ کرے کہ ہم دوسری قوم پر برتری اور فضیلت رکھتے ہیں حضور نبی کریمﷺ کا یہ آخری حج تھا اس حج کی تقریب پر شمع نبویﷺ کے گرد ایک لاکھ بیس ہزار پروانے جمع تھے۔ وہ حضورﷺ کا روح افزا خطبہ سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔ حضورﷺ نے فرمایا:

لا فضل لعربی علیٰ عجمی عرب کو کسی غیر عرب پر کسی طرح کی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ **ولا فضل لعجمی علیٰ عربی** اور کسی غیر عرب کو کسی عرب پر کسی طرح کی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ **ولا لا سود علیٰ احمر** کسی کالے رنگ کے شخص کو کسی سفید رنگ والے شخص پر فضیلت نہیں۔ **ولا لا حمر علیٰ اسود** کسی سفید رنگ کے شخص کو کسی کالے رنگ کے شخص پر فضیلت حاصل نہیں۔ **الا بالتقویٰ**

فضیلت صرف خدا خوفی اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے سوا فضیلت کا اور کوئی معیار نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ نظریہ ہمہ گیر ہے یہ وہ عرفان ومعرفت سے معمور نظریہ ہے جس کی زمانہ حال کی مغربی اقوام کو اشد ضرورت ہے۔

آج اقوام عالم کے دل و دماغ عموماً اور اہل یورپ کے خصوصاً اس روشنی سے نا آشنا ہیں۔ بے جا تکبر ونخوت کی وجہ سے بعض قومیں دوسری قوموں سے اپنے تیئں بہتر یقین کرتی ہیں۔

یہ لوگ کمزروں پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اوران کے اموال پر بے جا تصرف کرنے سے اوران کے حقوق کو پائمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ہٹلر نے یہ آواز بلند کی تھی کہ جرمن قوم سب قوموں سے اعلیٰ و بہتر ہے۔ اس نظریے سے سرشار ہوکراس نے اپنی قوم کو گمراہ کرر کھا تھا۔ جس کا نتیجہ بھیانک تباہی کے رنگ میں ظاہر ہوا۔ جس کی لرزہ خیز تفصیلات سے لوگ خوب واقف ہیں انگریز قوم پر بھی نیشلزم کا بھوت سوار ہے۔ یہ لوگ کسی دوسری قوم کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بلکہ وہ ہر دوسری قوم کے مقابل پر متکبرانہ رویہ اختیار کرنے کے عادی ہیں۔ جس جس مشرقی قوم پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ اس قوم کے دل و دماغ پراس امر کو مسلط کردیا گیا کہ انگریز آسمان سے نازل شدہ قوم ہے اوران کی ماتحت رعایاان کی دھول کے برابرنہیں ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور افریقہ کے لوگوں کے حقوق انگریزوں کے ہاتھوں پامال ہوئے اور ان کی عزت نفس مجروح ہوئی۔ آج بھی وہ انگلستان میں اہل مشرق کے ان باشندوں سے نہایت درجہ کی بدسلوکی کرر ہے ہیں جنھوں نے انکے وطن میں آبسیرا کیا ہے۔ اسی طرح وہ جنوبی افریقہ کے باشندگان سے نہایت درجہ کا ظلم وتعدی کا برتاؤ کرر ہے ہیں۔ اس ظلم وتعدی کی وجہ سے افریقہ میں بدنظمی و بدامنی کا دور دورہ ہے۔

اہل امریکہ کہنے کو جمہوریت کا وظیفہ پڑھتے اورامریکہ کو خدا کی دھرتی بیان کرتے ہیں لیکن دو کروڑ حبشی جو مدت ہائے دراز سے براعظم امریکہ کے نیشنل قرار دیئے جاچکے ہیں اور جن کا اکثر حصہ عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے ہے۔ اہل امریکہ کے حقارت آمیز سلوک سے نالاں ہیں۔ اہل امریکہ ایک کتے سے وہ سلوک روانہیں رکھتے جو حبشیوں کے لئے روارکھا جاتا ہے۔ اس ظلم اور تعدی نے امریکہ کے دوکروڑ حبشیوں میں ہیجان پیدا کر رکھا ہے۔ انکا ہیجان ایک طوفان کی صورت اختیار کرر ہا ہے اس بدنظمی اور بدامنی کا موجب وہ نقصان دہ نظریہ ہے جوامریکہ نے اہل علم ہونے کے باوجود حبشیوں کے متعلق اپنے دلوں میں جمارکھا ہے۔ یہ حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نظریہ جس کی تلقین نبی کریم ﷺ نے چودہ سو سال پیشتر حجۃ الوداع کے موقع پر کی تھی موجودہ زمانے کے حالات متقاضی ہیں کہ اس تعلیم پر عمل کیا جائے۔ اس قیمتی تعلیم کو عملی جامہ پہنانے سے دنیا کی اقوام کے درمیان امن قائم ہو سکے گا۔

مذکورہ بالا تعلیم کا ایک حصہ وہ بھی ہے جو ذیل آیت کریمہ میں مذکور ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا:

ولقد کرمنا بنی آدم یعنی ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

یہ تعلیم جہاں انسانیت کے پسماندہ حصہ کو ایک بلند مقام عطا کرتی ہے وہاں متکبر انسانوں کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ خدا کے اس فرمان کے مطابق بادشاہ اور کسان دونوں یکساں واجب التعظیم ہیں۔ آقا ہو یا غلام، پنڈت ہو یا شودر، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل دونوں قابل تکریم ہیں۔ مرد و عورت دونوں قابل تکریم ہیں، سفید و کالا دونوں قابل تکریم ہیں، اہل مشرق و اہل مغرب دونوں قابل تکریم ہیں، یہودی ہو یا ہندو، عیسائی ہو یا پارسی، سکھ ہو یا بدھ مذہب کا پیرو، مسلم ہو یا غیر مسلم سب کے سب واجب التعظیم ہیں۔ مختصراً یہ کہ جس مخلوق پر انسان کا لفظ اطلاق پاتا ہے وہ قابل تعظیم ہے۔

یہ نظریہ ساری انسانیت کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ ساری انسانیت کو عزت کے مقام پر کھڑا کرتا ہے اور ان کے درمیان امن کی فضا پیدا کرتا ہے۔

ولقد کرمنا بنی آدم کی آیت کریمہ ان لوگوں کے غلط عقیدہ کی اصلاح بھی کرتی ہے جو انسانوں کو فطرتاً گنہگار یقین کرتے ہیں۔ فرزند آدم کو طبعاً گنہگار قرار دینا اس کی پرلے درجہ کی بے حرمتی اور تذلیل ہے۔ مشاہدات اس نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ وہ کونسی قوم ہے جس میں بزرگ لوگ پیدا نہیں ہوئے ہندوؤں میں مہارشی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ آج بھی ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جھوٹ سے نفرت کرتے اور سچ سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں منصف مزاج لوگ موجود ہیں۔ جاتی کے لئے جانی و مالی قربانیاں کرنے والے موجود چلے آتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ انسان چونکہ فطرتاً گنہگار ہے اس لئے وہ گنہگار ہونے کی وجہ سے تناسخ کے چکر میں پھنسا رہتا ہے۔ عیسائیوں مین بھی ہمیشہ بزرگ ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جھوٹ نہیں بولتے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بد دیانتی کے نزدیک نہیں جاتے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو عدل وانصاف کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اور ایسے فیاض اشخاص ان میں پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے اموال غرباء کی بہبود کے لئے وقف کرتے

رہے ہیں پھر کس طرح سے یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ انسان فطرتاً گنہگار ہے۔ تورات میں لکھا ہے "خدا نے آدم کو اپنی شکل پر پیدا کیا"۔ اور انجیل میں لکھا ہے "آدم خدا کا بیٹا تھا"۔ یعنی آدم کو وہی صفات عطا کیں جن سے خدا خود متصف ہے۔ اگر خدا رحیم کریم ہے تو انسان کے دل میں بھی رحم و کرم کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ عفو و درگزر سے کام لیتا ہے تو ماں باپ اکثر اپنی اولاد کی خطاؤں کو معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور بادشاہ اپنی پیدائش کے دن کی تقریب پر خطا کار قیدیوں کو رہا کر دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی بہبود کے لئے سامان مہیا فرماتا ہے تو انسان بھی اپنی دولت غرباء کی بہبود پر صرف کرتے رہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے بھی تلقین کی ہے کہ تم اپنے قصوروار کو معاف کرو تا کہ خدا تمہارے قصور معاف کرے۔ معلوم ہوا کہ تورات اور انجیل دونوں میں یہ تعلیم موجود ہے کہ انسان میں خدائی صفات کا عکس پایا جاتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو انسان کو جس میں خدائی صفات کا عکس موجود ہے فطرتاً گنہگار قرار دینا غیر مناسب ہے اور قطعاً غلط ہے۔

جس شد و مد کی ساتھ عیسائی انسان کو گنہگار قرار دیتے ہیں۔ اسی شد و مد کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ ان کے اس عقیدہ کو غلط قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں طبیب بیماروں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ تندرستوں کے لئے اور میں بھی بیماروں کے لئے آیا ہوں نہ کہ تندرستوں کے لئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے نزدیک لوگ جہاں بیمار یعنی گنہگار ہوتے ہیں وہاں لوگ تندرست یعنی نیک و صالح بھی پائے جاتے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں خدا کا سورج نیکوں اور بدوں پر یکساں چمکتا ہے۔ اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے۔

پھر وہ بچوں کو معصوم قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "بچوں کو میرے پاس آنے دو کیونکہ آسمانی بادشاہت ایسوں کے لئے ہے"۔ وہ فرماتے ہیں بچوں کی طرح معصوم بن جاؤ۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی انسان فطرتاً پاک ہے نہ کہ گنہگار۔ پھر وہ فرماتے ہیں "نیکی اختیار کرو کیونکہ نیک کردار لوگ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونگے اور ان کی نیکی وہاں پر اپنی چمک اور شان دکھائے گی"۔ پھر وہ فرماتے ہیں۔ نیک عملوں کا اجر ملتا ہے اور

مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ "ایک بڑھیا جس کے پاس صرف دو دمڑیاں تھیں۔ اس نے اپنی پونجی خدا کی راہ میں خرچ کر دی اس کا اجر بہت بڑا ہے"۔ پھر وہ ایک شخص کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ "جب تک تو سارا مال خدا کی راہ میں صرف نہیں کر دیتا تو خدا کو نہیں پا سکتا"۔ پھر وہ فرماتے ہیں۔ "توبہ کرنے سے انسان پاک ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونے کا اہل بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ محصول لینے والے اور کسبیاں خدا کی بادشاہی میں داخل ہو جاتی ہیں"۔ تو معلوم ہوا جس طرح انسان پیدائش کے وقت تندرست جسم لیکر آتا ہے، اس طرح وہ تندرست روح لے کر آتا ہے۔ جس طرح اس کے جسم کو کبھی بیماری لاحق ہوتی ہے اور علاج کرنے پر تندرستی واپس آ جاتی ہے، اسی طرح سے جب انسان کی روح کو کبھی بیماری لاحق ہوتی ہے تو توبہ کرنے سے اس کی روحانی صحت واپس آ جاتی ہے۔ اس بارہ میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ جسمانیات اور روحانیات کے معاملات میں خدا کا ایک ہی قانون کام کرتا ہے فرمایا "جس خدا نے باہر کو بنایا کیا اس نے اندر کو نہیں بنایا"۔ کیونکہ جس خدا نے جسم بنایا ہے اسی نے قلب بنایا ہے یعنی جسم اور قلب کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے اس لئے ضروری ہے کہ جسم اور روح کی نشو و نما کا قانون ایک ہی ہو۔

ہندو اور عیسائی دونوں انسان کو گناہ میں لتھڑا ہوا بیان کرتے ہیں۔ لیکن حضور نبی کریم ﷺ نے اس خیال کو غلط قرار دیا ہے۔ اور اس کے برعکس فرماتے ہیں **ولقد کرمنا بنی آدم**۔ بنی آدم کو خدا تعالیٰ نے واجب التعظیم ٹھہرایا ہے۔ پس چاہیے کہ ہر انسان کی تعظیم کی جائے اور کسی انسان کو اچھوت قرار دے کر یا اس کو کمتر درجے کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔ یہ حقائق و شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی شخصیت دنیا کے لئے رحمت ہے۔

اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں مشکلات اور ان کا حل

مولانا سید محمد متین ہاشمی

1- بے یقینی سے یقین تک

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں سب سے بڑی دشواری یقین کی کمی اور احساس کمتری ہے۔ اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے جو قوم ڈیڑھ سو برس تک انگریزوں کی غلام رہ چکی ہو اس کی طبیعت میں اس قسم کے عناصر کا پیدا ہو جانا فطری ہے۔ اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ہم مغربی نظام عدل کو ملک میں باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ہماری تمام تر کوششیں اس کے لئے جاری ہیں کہ رائج الوقت مغربی نظام عدل سے ان شقوں کو وضع کر دیا جائے جو شریعت سے متصادم ہیں۔ یہ نظریہ سرے سے غلط ہے کیونکہ اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہر صورت و بہر حال ہم مغربی نظام عدل کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اسلامی نظام عدل کو ملک میں یکسر نافذ کرنے کے لئے اقدامات تجویز کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظام عدل کی جو اچھی اور مفید چیزیں ہیں اور اپنی نہاد میں اسلامی شریعت سے متصادم نہیں ہیں انہیں داخل کر لیتے اس کی ہزاروں مثالیں اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً خندق کھود کر دشمن سے مقابلہ کرنا، مجوسیوں کے طرز حساب کو اپنانا، فلسفہ یونان کو اسلامی عقائد کے اثبات کے لئے استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ۔

لہذا اولین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد کی حقانیت پر پختہ یقین قائم کریں اور پھر **واذا عزمت فتوکل علی الله** کا طرز عمل اختیار کریں کیونکہ:

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

معاشرے کو تیار کرنا

کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلامی نظام عدل کو کماحقہ، قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ ایک معاشرے کے لئے تقویٰ کا جو معیار ہونا چاہیے وہ ہمارے معاشرے میں موجود نہیں ہے۔

ہمیں اس سوال پر (دو زاویوں سے) غور کرنے کی ضرورت ہے۔
(الف) کیا نفاذ شریعت کو اس وقت تک معرض التواء میں رکھا جائے جب تک کہ معاشرہ اس کے لئے تیار نہ ہو جائے؟ یہ طرز فکر غلط اور منہاج نبوت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اصلاح معاشرہ کے دیگر عوامل کے علاوہ قوی ترین عامل خود نفاذ شریعت ہے۔ آپ روشنی لا یئے ظلمت خود بخود دور ہو جائے گی شریعت نور ہے اور معاشرے کے مفاسد نور کے آجانے کے بعد انشاء اللہ العزیز ظلمت خود بخود کافور ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ یہ کہنا کہ پہلے معاشرہ صحت مند ہو جائے تب شریعت نافذ کی جائے گی بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو کسی طبیب کے پاس لے جایا جائے اور طبیب کہے کہ اس وقت یہ بیمار ہے جب صحت مند ہو جائے تب میرے پاس لے کر آنا۔ حالانکہ شریعت ایک بیمار معاشرے کی خود طبیب ہے۔ اسے اپنی تمامتر برکات کے ساتھ آنے دیجئے وہ خود اس معاشرے کو صحت بخش دے گی۔ اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے پاس تو ہر مرض کے لئے سامان شفا بغیر کسی تحریف وتبدل کے موجود ہے جو انسان کے ظاہری و باطنی تمام امراض کے لئے ابدی دار وئے شفا ہے ارشاد باری ہے:

قل هوللذين اٰمنوا هدًى و شفآء (السجدہ: ۴۴)

ترجمہ: ''آپ اے میرے نبی کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے''۔

قل جآء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقاه وننزل من القراٰن ماهو شفآء ورحمة للمومنين (بنی اسرائیل: ۸۱)

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل تو مٹنے والا تھا اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں''۔

(ب) دوسری بات یہ کہ اگر اسلامی نظام عدل کو نافذ کرنا ہو تو اس کی شکل کیا ہو گی۔ اور معاشرے کو کس طرح تیار کیا جائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل کو نافذ کر دیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ معاشرے کو اسلامی نظام عدل کو قبول کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کے طریق پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے حالات کا بالاختصار جائزہ لے لیں۔

چند سالوں پہلے ہمارے معاشرے کی حالت بالکل سعدی کی اس حکایت کی طرح تھی جس میں سعدی نے اس شاعر کا واقعہ بیان کیا ہے جو ایک سرد رات میں پوستین پہن کر ڈاکوؤں کے قلعے میں گیا تھا۔ اس نے حسب عادت ڈاکوؤں کے سردار کی شان میں قصیدہ مدحیہ پڑھا اور سردار نے انعام دینے کے بجائے شاعر کے کپڑے اتروا کر ننگ دھڑنگ قلعہ سے باہر نکلوادیا رات کا وقت تھا کتوں نے جب شاعر بیچارے کو اس حال میں دیکھا تو بھونکنے لگے اور کاٹنے دوڑے شاعر بیچارہ جھکا کہ پتھر اٹھا کر کتوں کو مارے تو پتھر برف کے ساتھ جمے ہوئے تھے اس وقت شاعر نے کہا:

این چہ ..... کہ سنگ رابستہ وسگ راکشادہ

کہ یہ کیسا کمینہ ہے کہ پتھر تو باندھ دیئے ہیں اور کتوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

اب سے چند سالوں پہلے ہمارے معاشرے کا یہی حال تھا کہ اکابر اصاغر اور اصاغر اکابر بن گئے تھے۔ لاکھوں کے مجمع میں فخریہ اپنی شراب نوشی کا تذکرہ ہوتا تھا اور مجمع اس پر تالیوں کے ذریعہ داد دیتا بالکل وہی صورت تھی جسے بلقیس کی زبانی قرآن نے نقل کیا ہے کہ:

ان الملوك اذا دخلوا قريةً افسدوها وجعلوا اعذة اهلها اذلة (النحل: ۳۴)

ترجمہ: ''مطلق العنان بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد پھیلا دیتے ہیں اور بستی کے شرفاء کو ذلیل بنادیتے ہیں''۔

بحمد اللہ موجودہ حکومت جب سے آئی ہے یہ صورت حال نہیں ہے۔ تاہم فی الحال ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے سامنے ایک ایسی بالٹی دھرے بیٹھا ہے جس میں پانچ سو چھید ہیں اس بالٹی میں وہ شخص آب خیر مسلسل ڈالے جارہا ہے لیکن ان چھیدوں کی وجہ سے پانی بالٹی میں ٹھہرتا نہیں۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ خیر کا پانی معاشرے کی بالٹی میں ٹھہرے تو ہمیں سب سے پہلے ان سوراخوں کو بند کرنا ہوگا جن کے راستے تمام اچھی تعلیمات باہر نکل جاتی ہیں۔

تبلیغ

قرآن کریم نے اس کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وامر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر علىٰ ما اصابك ان

ذالک من عزم الامور (لقمان: ١٧)

ترجمہ: ''اور نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو اور جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو، بیشک یہ عظیم کاموں میں سے ہے''۔

ایک مقام پر ارشاد ہے:

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں با اختیار کر دیں تو یہ لوگ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیک کاموں کا حکم کریں، برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے''۔ (الحج: 41)

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ اپنی قوت بازو سے اسے روک دے لیکن اگر اسے اس بات کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اسے روکے اور اگر اس کی اس میں طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے اس برائی کو برا جانے لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

ان آیات و حدیث کی روشنی میں ضروری ہے کہ نفاذ عدل اسلامی کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام باضابطہ طور پر قائم کیا جائے۔

لہٰذا ضرورت ہے حکومت دانشور طبقہ، ادباء، شعراء، صحافی، اساتذہ، علماء، اور عوام سب مل کر معروف کی تبلیغ کریں اور منکرات کو اپنی استطاعت کے بموجب روکیں۔ انشاء اللہ العزیز اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو معاشرہ اصلاح پذیر ہو جائے گا۔

اسلام میں اس طریق کو ''طریق تبلیغ'' کہتے ہیں۔

ترغیب

تبلیغ کے بعد جو چیز معاشرے کو بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے وہ ترغیب ہے۔ اسی بناء پر ابتدائے اسلام میں مستحقین زکوٰۃ کی فہرست میں **والمولفة قلوبهم**۔ (نو مسلم لوگ) کو رکھا گیا تھا تا کہ کفار اسلام قبول کرنے کے مادی فوائد بھی دیکھیں اور محسوس کریں لہٰذا اگر کسی نظام کو عوام میں مقبول بنانا مقصود ہو تو تبلیغ کے ساتھ ساتھ ترغیبات بھی رکھنی چاہئیں۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنی معاشرت، اپنے طرز فکر اور اپنے نظام تعلیم کو مقبول بنانے کے لئے ترغیب ہی کا حربہ استعمال کیا تھا۔ اور ان لوگوں کو بڑے بڑے مناصب سے نوازا جنہوں نے ان

کے نظریات و افکار کو اپنایا تھا۔ اب اگر کوئی چاہتا ہے کہ اسلامی نظام عوام میں مقبول ہو اور لوگ اسلامی نظام عدل کے مطابق زندگی گزاریں تو ضرورت ہے کہ دینی علوم، دینی علوم کے حاملین اور اہل اصلاح و تقویٰ کو معاشرے میں پروقار حیثیت دی جائے تاکہ لوگوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔ سرکاری مناسب پر کسی کو مقرر کرتے وقت ضروری علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ امیدوار دینی علوم سے حسب ضرورت واقفیت رکھتا ہے یا نہیں نیز وہ اسلام کو موجودہ دور میں ایک مکمل نظام حیات تصور کرتا ہے یا نہیں؟ اس رویے سے انشاء اللہ العزیز خود بخود لوگوں کا رجحان دینی ماحول و معاشرت کی طرف ہو جائے گا۔

ترہیب

تبلیغ و ترغیب کے بعد تیسرا مرحلہ ''ترہیب'' کا آتا ہے یعنی اگر کوئی شخص ایسا دون فطرت اور کمینہ خصلت ہے کہ ابتدائی دونوں عوامل اس کی طبیعت کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوں تو پھر اسلامی حدود و عقوبات کو اس پر جاری کر دیا جائے اور از روئے قرآن **ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاٰخر** (النور:۲)

ترجمہ: ''تم کو ان دونوں پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کسی قسم کا ترس اور رحم نہ آئے اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو''۔

حدود کے نفاذ کو دو سال ہونے کو آئے۔ خیال تھا کہ معاشرہ صالح ہو جائے گا اور جرائم کا انسداد ہو جائیگا لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ جرائم کی شرح میں قابل ذکر کمی نہیں آئی اس کی یوں تو اور بہت ساری وجوہات ہیں لیکن ان میں یہ وجہ بھی اہم ہے کہ آج تک ملک میں ایک شخص پر بھی صحیح معنوں میں شرعی حد نافذ نہیں ہوئی ان حالات کو دیکھ کر جرائم پیشہ طبقہ حدود کو مذاق سمجھنے لگا ہے۔

لہٰذا ابتدائی دور میں غیر ضروری موشگافیوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ حد کا جرم ثابت ہوتے ہی حد نافذ کرنے کا حکم دے دینا چاہیے۔ (جاری)

اقبالؒ کا تصور خودی

مرسلہ سید رحمت اللہ شاہ

مفہوم: نبی کریم ﷺ کی نگاہ میں پست و بالا برابر درجہ رکھتے ہیں۔ (چنانچہ) آپ ﷺ اپنے غلام کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ جنگ کے دوران اس بلند مرتبہ شخصیت کے سامنے حاتم طائی کی بیٹی قیدی بن کر پیش ہوئی۔ اس کے پاؤں میں زنجیر تھی اور باپردہ لباس نہ ہونے کے باعث شرم وحیا سے گردن جھکائے تھی۔ آپ ﷺ نے جب اس لڑکی کو بے پردہ دیکھا، تو اپنی چادر سے اس کا سر ڈھانپ دیا۔ ہم (عہد حاضر کے مسلمان) قبیلہ طے کی اس خاتون سے زیادہ عریاں ہیں، اقوام دنیا کے سامنے ہم بھی (عزت واحترام) کی چادر کے بغیر ہیں۔ روز قیامت آپ ﷺ ہی (کی شفاعت) پر ہمارا بھروسہ ہے، اس دنیا میں بھی آپ ہی ہمارے عیب ڈھانپنے والے ہیں۔ حضور ﷺ کا لطف وقہر دونوں سراپا رحمت ہیں، لطف دوستوں کے لئے رحمت ہے اور قہر دشمنوں کے لئے۔ (مراد یہ کہ نبی کریم ﷺ کا قہر دشمنوں کو برائی اور گناہ سے بچاتا ہے)۔ حضور ﷺ نے اپنے دشمنوں پر بھی رحمت کے دروازے کھول دیئے۔ فتح مکہ کے بعد قریش کو یہ فرما کر کہ "آج تم پر کوئی تعزیر نہیں" انہیں معاف کر دیا۔ ہم مسلمان وطن کی (جغرافیائی) حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ ہم نگاہ کی مانند ہیں، جو دو آنکھوں کے نور سے مرکب ہونے کے باوجود ایک ہے۔ ہم حجاز، چین اور ایران کے شہری تو ہیں مگر ایک ہی صبح خنداں (حضور کریم ﷺ) کی شبنم ہیں (شبنم سے پھولوں کو تازگی ملتی ہے)۔ ہم ساقی بطحا کی کیف چشم سے سرشار ہیں، دنیا میں ہماری مثال مے اور مینا کی سی ہے (یعنی جو تعلق مینا اور مے کا ہے، یہی حضور کریم ﷺ اور امت مسلمہ کا ہے)۔ آپ ﷺ نے نسلی امتیازات کو یکسر جلا دیا، آپ ﷺ نے ان خس وخاشاک سے باغ دنیا کو پاک کر دیا۔ گل صد برگ کی مانند ہماری خوشبو ایک ہی ہے، نظام اسلام کی جان آپ ﷺ ہیں اور آپ ﷺ یکتا ہیں۔ ہم (امت مسلمہ) حضور ﷺ کے قلب میں پوشیدہ راز تھے، آپ ﷺ نے نعرہ بیباکانہ (لا الہ الا اللہ) بلند فرمایا اور ہم ظاہر ہوئے۔

مفہوم: اقبال فرماتے ہیں کہ میری خاموش بانسری میں حضور نبی کریم ﷺ کا جوش وخروش

ہے، میری آغوش میں سینکڑوں نغمے پرورش پا رہے ہیں۔ میں کیا کہوں کہ آپ ﷺ کی محبت کیا ہے، آپ ﷺ کی جدائی میں خشک لکڑی رونے لگی (اشارہ ہے حنانہ کے ستون کی طرف، جس کے ساتھ ٹیک لگا کر آپ ﷺ خطبہ دیا کرتے تھے، بعد میں جب آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو اس ستون سے رونے کی آواز آئی، چنانچہ صحابہ متعجب ہوئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ستون میری جدائی میں رو رہا ہے)۔ مسلمان کا وجود آپ ﷺ کی تجلیات کی جلوہ گاہ ہے۔ آپ ﷺ کی گرد راہ سے کئی طور پیدا ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کے آئینہ (قلب) نے مجھے وجود بخشا، میری صبح آپ ﷺ کے سینہ کے آفتاب کی مرہون منت ہے۔ پیہم تڑپ ہی میرے لئے تسکین کا باعث ہے، میری شام صبح محشر سے بھی زیادہ گرم ہے۔ آپ ﷺ پر بہار ہیں اور میں آپ ﷺ کا باغ ہوں، میرے تاکستان کی طراوت آپ ﷺ کی باران (رحمت) سے ہے۔

میں نے محبت کی کھیتی میں نگاہ شوق بوئی، اور نظارہ جمال کی صورت میں پیداوار حاصل کی۔ مدینہ منورہ کی خاک دونوں جہانوں سے پیاری ہے، کیا ٹھنڈک پہنچانے والا ہے وہ شہر جہاں محبوب آرام فرما ہے۔ میں مولانا جامی کے انداز بیان کا کشتہ ہوں، ان کی نظم اور نثر میری خامی کا علاج ہے۔ انہوں نے معانی سے بھرپور شعر کہا ہے، گویا حضور ﷺ کی تعریف میں موتی پرو دیئے ہیں۔ (شعر کا مفہوم یہ ہے کہ) آپ ﷺ کتاب کونین کا مقدمہ ہیں، سارا جہاں غلام ہے، صرف آپ ﷺ آقا ہیں۔ عشق کی شراب سے کئی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، تقلید بھی عشق ہی کا نام ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ جو (محبت میں) کامل تھے، وہ تقلید میں بھی بے مثال تھے، چنانچہ انہوں نے اس بنا پر خربوزہ کھانے سے اجتناب کیا، کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے اسے کس طرح کھایا تھا۔ اگر تو عاشق ہے تو محبوب کی تقلید سے اپنے عشق کو محکم کرتا کہ تو اپنی محبت کی کمند سے اللہ تعالیٰ کو بھی شکار کر سکے، (تفسیر ہے اس آیت کی کہ "اسے کہیں! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا")۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے دل کے (غار) حرا میں خلوت اختیار کر، اپنے آپ کو چھوڑ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر۔ پھر اللہ تعالیٰ کی محبت سے محکم ہو کر اپنی طرف لوٹ آ اور ہوس کے بتوں (لات وعزیٰ) کا سر توڑ دے۔ عشق کی قوت

عشق کے فاران کی چوٹی پر جلوہ گر ہو۔ تا کہ رب کعبہ تجھے اپنی تجلی سے نواز دے
فکر تیار کر اور
خلافت الٰہیہ کے بلند منصب پر فائز کرے!

اس بیان میں کہ خودی سوال سے کمزور ہو جاتی ہے

اے مسلمان کبھی تو شیروں سے خراج وصول کرتا تھا اب حاجت مندی کے سبب تیری طبیعت لومڑی کی سی ہوگئی ہے۔ تیری آزردگی کا باعث تیری ناداری ہے، تیری ساری تکلیف کی وجہ یہی بیماری ہے۔ ناداری فکر بلند سے رفعت چھین لیتی ہے اور اعلیٰ افکار کی شمع کو گل کر دیتی ہے۔ تو ہم کی صراحی سے رنگیں شراب لے (اور) زمانے کی جیب سے اپنی نقدی نکال۔ حضرت عمرؓ کی طرح (اپنا گرا ہوا کوڑا اٹھانے کے لئے) خود اونٹ سے نیچے اتر، دوسروں کا احسان اٹھانے سے گریز کر اور اس سے پناہ مانگ۔ تو کب تک منصب کی بھیک مانگتا رہے گا (اور) کب تک بچوں کی طرح سرکنڈے کا گھوڑا بنائے گا۔ وہ فطرت بلند جو آسمان پر نظر رکھتی ہے، دوسروں کے احسان سے پست ہو جاتی ہے۔ سوال کرنے سے خودی کے اجزاء بکھر جاتے ہیں اور خودی کا نخل سینا تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔ سوال سے مفلسی اور ذلیل ہو جاتی ہے (اور) گدائی سے گداگر مزید نادار ہو جاتا ہے۔ اپنی مشت خاک کو اور منتشر نہ کر (بلکہ) چاند کی طرح اپنے پہلو سے اپنا رزق حاصل کر۔ اگرچہ تیری روزی تنگ ہو اور تیرا نصیب مددگار نہ ہو، اور تو مصائب کے سیلاب کے بھنور میں پھنسا ہو۔ پھر بھی تو دوسروں کی نعمت سے رزق کا متلاشی نہ ہو (اور) چشمہ مشرق سے بھی موج آب کا جویا نہ ہو۔ تا کہ تجھے کل (قیامت کے دن) جو انتہائی کرب انگیز ہوگا، حضور ﷺ کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ چاند، سورج کے دسترخوان سے روزی پاتا ہے، اس لئے اس کے دل میں پر احسان کا داغ پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگ اور حالات کا مقابلہ کر، (کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر) ملت اسلامیہ کی آبرو زائل نہ کر۔ جس ذات گرامی ﷺ نے کعبہ کو بتوں کی خس و خاشاک سے پاک کیا، ان کا ارشاد ہے کہ محنت کش اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔ افسوس ہے اس شخص پر جو دوسروں کے دسترخوان کا احسان مند ہے اور جس کی گردن دوسروں کے احسان کے باعث جھکی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو احسان کی بجلی سے جلا لیا، (گویا) اس نے ایک کوڑی

کے بدلے غیرت کا قیمتی سرمایہ فروخت کر دیا۔ کیا خوب ہے وہ شخص جو کڑی دھوپ کے اندر پیاسا ہونے کے باوجود خضر سے بھی پانی کا طلب گار نہ ہو۔ جس کی پیشانی پر سوال کرنے کی شرمندگی سے پسینہ نہیں آتا، جو اپنی آدمیت برقرار رکھتا ہے (اور) مٹھی بھر خاک کی طرح بے قدر نہیں ہوتا۔ یہ بلند بخت نوجوان آسمان کے نیچے صنوبر کی طرح سر اٹھا کر چلتا ہے۔ اگر وہ خالی ہاتھ ہو تو اور بھی خوددار ہو جاتا ہے، اس کا نصیب سو جائے تو وہ اور بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ کشکول اگر سمندر کی طرح بھرا ہوا ہو تو وہ آگ کا سیلاب ہے، (اس کے برعکس) اگر اپنی کوشش و محنت سے چند قطرے بھی کما لئے جائیں تو یہ بہت بہتر ہیں۔ بلبلہ کی طرح اپنی مردانہ غیرت قائم رکھ (اور) سمندر کے اندر بھی اپنے پیمانے کو الٹائے رکھ!

اس بیان میں کہ جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو وہ نظام عالم کی ظاہری و مخفی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے:

اقبال فرماتے ہیں کہ جب خودی عشق الٰہی سے استحکام پکڑتی ہے، تو اس کی قوت زمانے کی فرماں روا بن جاتی ہے۔ بوڑھا آسمان جس نے ستاروں سے آرائش کی ہے، اس کی شاخوں کے غنچے (ستارے) ٹوٹ گرتے ہیں۔ (عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ انسان کی قسمت ستاروں کی گردش سے وابستہ ہے۔ لیکن بقول اقبال جو شخص اپنی خودی مستحکم کر لیتا ہے وہ خود تقدیر کا فرماں روا ہو جاتا ہے اور ستارے اس کے سامنے بے معنی ہیں)۔ اس کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہو جاتا ہے، (پھر) اس کی انگلی کے اشارہ سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص دنیا کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے۔ (اور) دارا اور جمشید جیسے بادشاہ بھی اس کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ میں تمہیں بو علی قلندرؒ کا واقعہ سناتا ہوں کہ اطراف ہند میں ان کا نام معروف ہے۔ ''باغ کہن'' کے اس ترانے سنانے والے نے ہم سے ''گل رعنا'' کی بات کہی ہے۔ (جنت کا یہ خطہ) جو بت پرستی کے باعث آتش نہاد بنا ہوا تھا، اس کے دامن کی ہوا سے واقعی بہشت کا ٹکڑا بن گیا تھا۔ ان کا مرید بازار کی طرف گیا، وہ حضرت بو علی قلندرؒ کی شراب (معرفت) سے سرشار تھا۔ اس شہر کے حاکم کی سواری بھی ادھر سے گزری، حاکم کے ساتھ کئی غلام اور چوبدار تھے۔ ان میں سے ایک نے آواز دی کہ اے بے سمجھ!

کم کے ہمراہیوں کا راستہ نہ روک۔ مگر وہ درویش سر جھکائے اپنے افکار کے سمندر میں غوطہ زن کی طرح چلتا رہا۔ دوسری طرف چوبدار اپنے تکبر میں مست تھا، (چنانچہ) اس نے درویش کے سر پر لاٹھی دے ماری۔ درویش، حکمران کے ہاتھوں آزردہ خاطر، رنجیدہ، ناخوش اور افسردہ گیا۔ اس نے حضرت بو علیؒ کے سامنے فریاد کی اور آنکھوں سے آنسو بہائے۔ اس کی فریاد سن کر شیخ (بو علی) پہاڑ پر گرنے والی بجلی کی طرح اپنی گفتگو سے شعلہ بار ہوئے۔ ساتھ ہی ان کے اندر سے ایک اور طرح کی آگ نے سر اٹھایا، (چنانچہ انہوں نے) اپنے منشی کو بلا کر فرمایا (کہ) قلم اٹھا اور اس فقیر سے بادشاہ کی طرف فرمان لکھ۔ (کہ) میرے درویش کو تیرے عامل نے سر پر لاٹھی ماری ہے، گویا اس نے اپنی متاع جان پر چنگاری پھینک دی ہے (جو اسے جلا کر بھسم کر دے گی)۔ اس بدخو عامل کو یہاں سے واپس بلا، ورنہ میں تیری بادشاہت کسی اور کو دے دونگا۔ اس خدا رسیدہ بندے کے خط نے بادشاہ کے بدن پر کپکپی طاری کر دی۔ اس کے رگ و پے میں رنج و غم کا طوفان امڈ آیا اور اس کا چہرہ شام کے سورج کی طرح زرد پڑ گیا۔ اس نے حاکم کی گرفتاری کا حکم جاری کیا اور قلندر سے اپنی غلطی کی معافی کا خواستگار ہوا اور امیر خسرو جو شیریں زباں اور رنگیں بیاں تھے، جن کے نغمے گویا ضمیر کائنات کے اندر سے پھوٹتے تھے۔ جن کی فطرت چاندنی کی مانند روشن تھی، انہیں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب امیر خسرو نے قلندر کے سامنے ساز سے نغمہ گایا، تو ان کی آواز نے درویش کے شیشہ جاں کو پگھلا دیا۔ وہ سطوت جو پہاڑ کی مانند مستحکم تھی، ایک نغمہ نے اسے خرید لیا۔ درویشوں کے دل کو زخمی نہ کر، ایسا کرنا اپنے آپ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

اس مطلب کی وضاحت کے لئے حکایت کہ نفی خودی کا مسئلہ محکوم اقوام کی اختراع ہے، تاکہ وہ اس مخفی طریق سے اقوام غالبہ کے اخلاق کو کمزور کریں:

اقبال کہتے ہیں کہ کیا تم نے سنا ہے کہ پرانے زمانہ میں بہت سی بھیڑ بکریاں ایک چراگاہ میں رہتی تھیں۔ گھاس کی کثرت کے باعث ان کی نسل میں اضافہ ہو رہا تھا (اور) وہ دشمنوں سے بے خطر تھیں۔ پھر بدقسمتی کے باعث ان کا سینہ مصائب کے تیروں سے چھلنی ہو گیا۔ (وہ یوں کہ)

جنگل سے شیر نکل آئے اور انہوں نے چراگاہ پر شب خون مارنے شروع کر دیئے۔ جذب اور تسلط قوت کا شعار ہیں (اور) فتح قوت کا کھلا بھید ہے۔ شیروں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور بھیڑ بکریوں کو ان کی آزادی سے محروم کر دیا۔ چونکہ شیروں کو شکار کے سوا کچھ آتا ہی نہیں (یعنی صرف شکار ہی ان کا کام ہے) اس لئے وہ چراگاہ بھیڑ بکریوں کے خون سے سرخ ہو گئی۔ ایک دانا اور دانش مند بھیڑ تھی، جو بوڑھی بھی تھی اور تجربہ کار تھی۔ وہ اپنی قوم کے حالات سے سخت پریشان ہوئی (اور) شیروں کے مظالم سے اس کا سینہ زخمی ہو گیا۔ اس کے تئیں بھیڑ بکریوں کی تقدیر بدل جانے کا شکوہ پیدا ہوا، چنانچہ اس نے تدبیر سے اپنا کام (ارادہ) پکا کیا۔ کمزور آدمی اپنی حفاظت کے لئے گرہ کشا عقل سے حیلے تراشتا ہے۔ غلامی میں اپنی مشکلات دور کرنے کے لئے تدبیر کی قوت زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ جب انتقام کا جنون پختہ ہو جاتا ہے تو غلام کی عقل فتنے سوچتی ہے۔ اس بوڑھی بھیڑ نے اپنے آپ سے کہا کہ ہمارا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے (کہ) ہمارے غموں کے سمندر کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا۔ بھیڑ اپنی قوت سے تو شیر سے چھٹکارا نہیں پا سکتی، (اس لئے کہ) ہماری کلائی نازک ہے، جبکہ شیر کا پنجہ فولاد کی طرح مضبوط ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ وعظ و نصیحت کے زور سے بھیڑ کے اندر بھیڑیے کی عادت پیدا ہو جائے۔ البتہ بہادر شیر کو بھیڑ بنایا جا سکتا ہے اور اسے اپنے آپ سے غافل کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ اس نے صاحب الہام ہونے کا دعویٰ کیا اور خونخوار شیروں کو وعظ کہنا شروع کر دیا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ اے جھوٹو! اے شریرو! تم اس دن سے بے خبر ہو جو سخت منحوس ہے۔ مجھے روحانی قوت عطا کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیروں کے لئے نبیہ (متنبہ کرنیوالی) بنایا گیا ہے۔ میں اندھوں کے لئے روشنی لے کر آئی ہوں، مجھے اس کام پر مامور کیا گیا ہے اور نیا دستور دیا گیا ہے۔ تم اپنے برے کاموں سے توبہ کرو، اے اپنا نقصان سوچنے والو! اپنے بھلے کی تدبیر کرو۔ جو بھی غضبناک اور طاقتور ہو وہ بد بخت ہے، کیونکہ زندگی خودی کے مٹا دینے سے پختہ ہوتی ہے۔ نیکوں کی روح گھاس سے غذا حاصل کرتی ہے (اور) گوشت ترک کر دینے والا اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے۔ دانتوں کی تیزی تجھے ذلیل کر دیتی ہے اور تیرے فہم کی آنکھ کو اندھا بنا دیتی ہے۔ جنت صرف کمزوروں کے لئے ہے قوت خسارے کا

بہ بنتی ہے۔ عظمت وشوکت کی خواہش گناہ ہے (اور) افلاس، دولت مندی سے بہتر ہے۔

ملہوم: بھیڑ شیروں سے کہتی ہے کہ جلا دینے والی بجلی ایک دانے کی گھات میں نہیں رہتی (یعنی اسے خرمن کی تلاش ہوتی ہے) لہٰذا دانہ اگر خرمن بنے تو اس کی عقلمندی نہیں۔ اگر تو عقلمند ہے تو ذرہ ہی رہ، صحرانہ بن تا کہ آفتاب کے نور سے بھرپور فائدہ اٹھا سکے۔ تم جو بھیڑوں کو چیرنے پھاڑنے پر فخر کرتے ہو، اپنی خودی کو ذبح کرو، تا کہ تم عزت پاؤ۔ جبر، قہر، انتقام اور اقتدار زندگی کو کمزور بنا دیتے ہیں۔ سبزہ پاؤں تلے روندا جاتا ہے اس لئے بار بار اگ آتا ہے اور (یوں وہ) اپنی آنکھ سے موت کی نیند کو بار بار دھولیتا ہے۔ اگر تو عقلمند ہے تو اپنے آپ سے غافل ہو جا (کہ) جو اپنے آپ غافل نہیں وہ دیوانہ ہے۔ آنکھ، کان اور لب بند رکھ، تا کہ تیری فکر آسمان کی بلندی تک پہنچے۔ دنیا کی یہ چراگاہ بالکل ہیچ ہے (لہٰذا) اے نادان! تو اس سے دل نہ لگا۔ شیروں کا گروہ سخت محنت سے تھک چکا تھا اور ان کا دل تن پرستی کی طرف مائل تھا۔ انہیں یہ خواب آور نصیحت بہت پسند آئی، اپنی کمزوری کے باعث وہ بھیڑ کی باتوں میں آ گئے۔ وہ جو بھیڑوں کا شکار کرتے تھے، انہوں نے بھیڑوں کا طریق اختیار کر لیا۔ شیروں نے گھاس کھانا شروع کر دی (یوں) بالآخر شیری کا گوہر ٹھیکری میں تبدیل ہو گیا۔ گھاس کھانے سے ان کے دانتوں کی تیزی ختم ہو گئی (اور) ان کی شرارے برسانے والی آنکھوں کی ہیبت جاتی رہی۔ سینے کے اندر دل نہ رہے (اور) آئینے کا جوہر آئینے سے جاتا رہا۔ (پھر) ان کے اندر جہد مسلسل کا جنون نہ رہا اور ان کے دلوں سے ولولہ عمل ختم ہو گیا۔ اقتدار، عزم، استقلال، اعتبار، عزت اور اقبال (سب) جاتے رہے۔ ان کے فولادی پنجے کمزور پڑ گئے، دل مر گئے اور بدن قبریں بن گئیں۔ بدن کی قوت کم ہو گئی اور جان کا خوف بڑھ گیا، خوف جاں نے ہمت کی پونجی ختم کر دی۔ بے ہمتی سے کوتہ دستی، بے دلی اور کمینگی جیسی سینکڑوں بیماریاں پیدا ہو گئیں۔ (یوں) بیدار شیر بھیڑ کے جادو سے سو گیا اور اپنے انحطاط کو تہذیب کہنے لگا۔ (جاری)

اختلافی مسائل اور ان کا نقطہ عدل

صدرالدین اصلاحی

اسلام وحدت کا پیام لے کر آیا تھا مگر اس وقت جہل و تعصب کے ہاتھوں میں پڑ کر وہ اختلاف و تنازع کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ مذہب کے چند جزئی مسائل نے باہمی ہنگامہ آرائیوں کا جو طوفان عظیم بپا کر رکھا ہے ان کی حقیقت پر جب میں نے پوری طرح غور کیا تو یہ پایا کہ ہر گروہ حق و اعتدال کے مرکز سے کچھ نہ کچھ ہٹا ہوا ہے اور بے جا تعصب اور غلو سے کام لے رہا ہے۔ ہر ایک اتباع حق کا مدعی ہے، مگر سچائی کی اخلاص طلب شاہراہ پر چلنے کے بجائے جذبات کی لہروں میں بہ رہا ہے۔ مجھے رحمت الٰہی کا شکر گزار ہونا چاہیے، کہ اس نے مجھے عدل کی میزان بھی بخش دی ہے جس پر حق اور باطل کو تول کر میں اندازہ کر رہا ہوں کہ حق کی سیدھی اور صاف راہ کونسی ہے، اور وہ اس وقت کس طرح اختلافات کی خارزار بن گئی ہے، اور ان نزاعات و اختلافات کی بنیاد کیا ہے۔

اہل زمانہ کی اس افسوس ناک حالت کو دیکھ کر ضروری معلوم ہوا کہ ان مسائل کی اصل نوعیت انہیں سمجھا دی جائے جن کی اندر ان کے افکار الجھ کر رہ گئے ہیں، اور جن کی تائید و تردید میں ان کے قلم بغیر کسی سچی بصیرت کے بیجا جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں۔

ان میں سے سب سے اہم مسئلہ تقلید کا ہے۔ آئمہ اربعہ کی تقلید کا جواز قریب قریب ساری امت کا اجتماعی مسئلہ ہے، اور اس کے اندر جو مصالح ہیں انہیں ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے؛ خصوصاً اس پر آشوب زمانہ میں جب کہ عام قوائے فکریہ پر جمود اور دوں ہمتی کی موت سی طاری ہے، دلوں میں طلب حق کا کوئی جوش اور ولولہ باقی نہیں۔ شریعت کی قوانین انسانی آراء پر قربان کیے جا رہے ہیں اور ہر کس و ناکس خود پرستی اور خود رائی کے نشہ میں چور ہے۔

تقلید کے بارے میں ابن حزم کے اس قول نے کہ ''آیات قرآنی اور اجماع سلف کی رو سے تقلید حرام ہے اور خود ائمہ مجتہدین نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے''۔ لوگوں کو عجیب غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے اور ہر عامی و جاہل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ

قول بجائے خود بالکل برحق ہے۔ اپنا ایک خاص محل اور معنی رکھتا ہے اور اس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے:

(۱) جو اپنے اندر اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو، خواہ ایک ہی مسئلہ میں سہی۔

(۲) جو اچھی طرح جانتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں بات کا حکم دیا ہے، یا فلاں بات سے روکا ہے، اور یہ حکم منسوخ نہیں ہے۔ اس بات کا علم خواہ اسے احادیث کے تتبع اور مخالف و موافق دلائل کے استقراء سے حاصل ہو، یا یہ دیکھ کر کہ ارباب علم وبصیرت کا سواد اعظم اس طرف جا رہا ہے اور مخالف کے پاس قیاس آرائیوں اور منطقی دقیقہ سنجیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ایسی صورت میں حدیث نبوی کی مخالفت کا سبب یا تو کھلا ہوا احمق ہو سکتا ہے یا چھپا ہوا نفاق۔

شیخ عزالدین عبدالسلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حیرت ہوتی ہے ان تقلید پرست فقہا پر جو اپنے امام کی اجتہادی غلطی سے واقف ہونے کے بعد اس کے قول پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور اسے ترک کر کے کسی ایسے قول کو اختیار نہیں کرتے جو اپنی صحت پر کتاب وسنت اور قیاس صحیح کے بے شمار شواہد رکھتا ہو، بلکہ بعض اوقات تو یہ نادان اس اندھی تقلید کے اندھے جوش میں عملاً ظواہر کتاب وسنت کی بھی مخالفت پر تل جاتے ہیں اور اپنے امام کی اصابت رائے بلکہ "معصومیت" ثابت کرنے کے لئے نصوص شرعیہ کی ایسی رکیک، مہمل اور فاسد تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر تحریف کلام کی مکروہ اور حیرت انگیز مثال شاید ہی مل سکے"۔

پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"صدر اول میں جس سے بڑھ کر مبارک اور حق شناس دور شاید قیامت تک نہ آئے، لوگوں کا حال یہ تھا کہ جس عالم دین کو پا جاتے اسی سے فتویٰ پوچھ لیا کرتے تھے، بغیر اس تحقیق اور تجسس کے کہ یہ عالم کس خیال اور مسلک کا پیرو ہے لیکن اس دور کے بعد کی حالت میں ایک عظیم الشان فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ چار مذاہب اور ان کے جامد مقلدین کا ظہور ہوتا ہے اور ہدایت کے اصل

مرکز سے بالکل بے پرواہ ہو کر صرف آئمہ کے اقوال پر اعتماد کر لیا جاتا ہے خواہ ان کا کوئی قول کتنا ہی کمزور اور بے دلیل و حجت ہو۔ گویا مجتہد، مجتہد نہ رہا، اللہ کا رسول بنالیا گیا، جو خود معصوم ہے اور اس کی ہر بات وحی الٰہی ہے۔ یہ راستہ حق کا راستہ نہیں ہے بلکہ سراسر جہل اور باطل کا راستہ ہے"۔

امام ابوشامہ کا فیصلہ بھی سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"جو شخص فقہ سے دلچسپی رکھتا ہو اسے چاہیے کہ کسی ایک ہی امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر مجتہد کے اقوال پر نظر ڈالے۔ تمام کے اندر ڈوب کر حق کا سراغ لگائے اور اس غواصی میں اسے جو قول قرآن وسنت سے زیادہ اقرب ملے اسی کو اختیار کرے۔ اگر علوم اوائل کے ضروری حصوں پر اس کی نگاہ ہوگی تو انشاءاللہ یہ قوت تمیز اسے بآسانی حاصل ہو جائے گی اور کسی دقت اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر وہ شریعت کی اصل شاہراہ پالے گا۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ تعصب کے مہلک جراثیم سے اپنے دماغ کو پاک رکھے اور اختلاف ونزاع کی ان پر خطر وادیوں میں ہرگز قدم نہ رکھے جسے متاخرین نے تیار کر رکھا ہے، کیونکہ وہاں تضیع اوقات اور انتشار طبع کے ماسوا کچھ نہیں مل سکتا۔ امام شافعیؒ نے خود اپنی اور ہر دوسرے امام کی تقلید سے منع فرمایا ہے۔ جس کا ذکر مزنی نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے کیا ہے"۔

(۳) ابن حزم کا فتویٰ اس شخص پر بھی منطبق ہوتا ہے جو عامی اور علم دین سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر تقلید کرنے میں تو حق بجانب ہو، مگر وہ کسی خاص امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہو کہ اس سے خطا کا ارتکاب غیر ممکن ہے اور اس کا امام جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے۔ نیز اس اعتقاد کے ساتھ وہ اپنی جگہ یہ فیصلہ بھی کر لے کہ اس خاص امام کی تقلید پر وہ ہر حال میں قائم رہے گا خواہ کسی مسئلہ میں اس کے قول کا خلاف قرآن وحدیث ہونا ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہی وہ ذہنیت ہے جس نے بنی اسرائیل کی توحید کو بالکل شرک سے بدل دیا تھا جیسا کہ امام ترمذی نے عدی ابن حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"آنحضرت ﷺ نے آیت **"اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"** پڑھ کر فرمایا کہ یہود اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کی عبادت تو نہیں

کرتے تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو ان کے علماء اور مشائخ حلال کہہ دیتے اسے وہ (بغیر کسی شرعی دلیل کے) حلال مان لیتے تھے اور جس کو وہ حرام قرار دیتے تھے اسے وہ حرام سمجھ لیتے تھے"۔

پس کسی امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرنا کہ اس کی زبان عین شریعت کی زبان ہے یقیناً غیر اللہ کی پرستش ہے۔

(۴) جو شخص اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ، یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کی پیچھے نماز پڑھے، وہ بھی ابن حزم کے فتوے کی زد میں آجاتا ہے، اس لئے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہ و تابعین کرام کے عمل کی کھلی ہوئی مخالفت ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشا۔ ان قیود اور شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا، اور جہاں صورت حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص ہے جو محض اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دین سمجھتا ہے، صرف اسی چیز کی حلت کا اعتقاد رکھتا ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا ہو، اور صرف اسی شے کو حرام سمجھتا ہے جسے اللہ اور رسولؐ نے حرام قرار دیا ہو۔ یعنی تحریم و تحلیل کا حق وہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی اور کو نہیں دیتا، لیکن اس ایمان اور اعتقاد کے باوجود چونکہ وہ اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وسیع نظر نہیں رکھتا، نہ متعارض نصوص کو تطبیق دینے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ نصوص شرعیہ سے احکام کو استنباط کر سکتا ہے اس لئے اگر وہ ایک ایسے ثقہ اور صحیح النظر عالم دین کا اتباع کرتا ہے جو اس کے نزدیک سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فتویٰ دینے والا ہے، اور یہ اتباع بھی وہ اس نظریہ کے ساتھ کرتا ہے کہ جب بھی کوئی نص شرعی اس کی خلاف ملے گی تو بغیر کسی تعصب اور اصرار کے وہ اس قول کو ترک کر دے گا، تو پھر نہیں معلوم کہ کوئی شخص کیونکر ایسی تقلید یا اتباع کو ناجائز کہہ سکتا ہے، جب کہ عہد نبوی سے لے کر اب تک تمام مسلمانوں میں افتاء اور استفتاء کی یہی سنت متواتر چلی آرہی ہے۔ اب خواہ کوئی انسان کسی ایک ہی فقیہ سے ہمیشہ فتویٰ پوچھا کرتا ہو یا کبھی ایک فقیہ سے اور کبھی دوسرے سے تو دونوں فعل جائز ہیں۔ بشرطیکہ مستفتی، فقیہ

اور رسولؐ کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

پس ہماری تقلید پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے جب کہ ہم کسی امام کے متعلق یہ ایمان نہیں رکھتے کہ وہ معصوم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر علم فقہ کی وحی نازل فرمائی ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض کردی ہے۔ ہم تو اگر کسی امام کا اتباع کرتے ہیں تو یہ جان کر کرتے ہیں کہ وہ کتاب وسنت کا عالم اور روح شریعت کا مزاج شناس ہے۔ اس لئے اس کا قول یا تو آیات واحادیث کے صریح دلائل پر مبنی، یا ان سے ماخوذ اور مستنبط ہے یا پھر قرآن سے اس نے یہ بات تحقیق کرلی ہے کہ یہ حکم فلاں علت کی بناء پر ہے اور جب اسے اپنی فہم کی صحت پر پورا اطمینان ہوگیا ہے تب ہی اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے، گویا وہ دراصل زبان حال سے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ میرے خیال میں شارع علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے گی وہاں یہی حکم جاری ہوگا اور ایسے تمام قیاسی احکام اسی عموم میں داخل ہونگے، یا بالفاظ دیگر یہ اقوال بھی شارع علیہ السلام کی طرف منسوب شمار کئے جائیں گے اگرچہ ان کی قطعیت یقینی اور شکوک سے بالکل پاک نہیں کہی جاسکتی۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی مسلم کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ پس اگر رسول معصوم ..... کہ صرف آپ ہی کی اطاعت اللہ نے ہم پر فرض کی ہے ..... سے ہمیں کوئی ایسی صحیح روایت مل جائے جو قول امام کی مخالفت کرتی ہو، اور پھر بھی ہم اس کی درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے نص قطعی کو چھوڑ کر ظن انسانی کی تقلید پر جمے رہیں، تو ہم سے بڑھ کر شقی اور نامراد کون ہوگا، اور کل خدائے قہار کے سامنے ہم کیا جواب دیں گے؟

جائز تقلید کی صحیح تصویر یہی ہے جو چند لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔ اگر امت مسلمہ غلو سے اپنے قوائے فکر یہ کو آزاد کرلے اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کے پردے ہٹا کر اصل تصویر دیکھنے لگے تو بہت سے لفظی نزاعات ختم ہوجائیں اور مذہبی اختلافات کی شورانگیز فضا کس قدر امن وسکون کی خوش گواریوں سے بدل جائے۔

مسئلہ تقلید کے بعد دوسرا اہم مسئلہ استخراج مسائل کا ہے، جس کے دو اصول ہیں:

ایک تو یہ کہ الفاظ حدیث کا تتبع کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ فقہاء کے اصول کو سامنے رکھ کر مسائل استنباط کیا جائے۔ شرعاً ان دونوں اصلوں کی اہمیت مسلم ہے۔ ہر دور کے فقہائے محققین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں اصلوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ کوئی ایک کی رعایت زیادہ کرتا کوئی دوسرے کی۔ لیکن ایسا کبھی نہ کرتے کہ کسی اصل کو بالکلیہ ترک کر دیں۔ پس کسی جویائے حق کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیسا کہ آج دونوں فریق کا عام شیوہ ہے۔ اور یقین کرو کہ ان کا یہی ''شیوہ'' ان کی ساری ضلالتوں کا ذمہ دار ہے۔ ان دونوں اصلوں کو الگ الگ کر کے ہدایت کی سیدھی راہ پانا بہت مشکل ہے۔ حق کا راستہ یہ ہے کہ ان میں تفریق کرنے کے بجائے دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے، اور ایک سے دوسرے کی عمارت ڈھانے کے بجائے اس کے کمزور مقامات اصلاح اور تشدید کا کام لیا جائے۔ اس طرح احکام دین کا جو قصر تعمیر ہوگا نہایت مستحکم اور حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوگا۔ اور اس میں باطل کے راہ پانے کی کوشش قریب قریب بیکار ثابت ہوگی۔ اسی محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سنتكم والله الذى لا اله الا هو بينهما بين الغالى والجانى

''اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک (بوجہ سہل انگاری کے) نہ پہنچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے''۔

یعنی حق کا مرکز افراط تفریط کے بیچ میں ہے۔ جو اہل حدیث ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی رایوں پر پیش کر لیا کریں۔ اسی طرح جو اہل تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کیا کرتے ہیں، انہیں بھی چاہیے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان نہ کریں، اور نہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ فرمودہ نبوی کی صریح مخالفت کا انہیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدث کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان اصول حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغل سے کام لے جنہیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے، کیونکہ بہر حال وہ بھی انسان ہی تھے،

فکر و نظر کی لغزشوں سے ان کے بنائے ہوئے قواعد محفوظ نہیں کہے جا سکتے اور نہ شارع کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے۔ اس اصول پرستی کے تشدد آمیز رویہ سے بسا اوقات حدیث، اور قیاس صحیح دونوں کو رد کر دینا پڑتا ہے مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور نا قابل استناد ٹھیرا دی جاتی ہیں، حالانکہ فی نفسہ وہ قول رسول ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو نا قابل حجت قرار دے دیا، صرف اس وجہ سے کہ امام بخاری کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہ صحیح اور اس کا سلسلہ اسناد متصل ہے۔ ہاں اگر کسی قوی نص سے تعارض ہو تو البتہ انقطاع کے شبہ کی بنا پر اسے مرجوع قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حدیث کو سرے سے متروک ٹھیرا دینا یقیناً زیادتی ہے۔

اسی طرح ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اتنا اعتناء نہیں کرتا، تو کلیتہً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدم اور مرجح مانی جائے گی، خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح اور برتری کے کتنے ہی واضح دواعی کیوں نہ موجود ہوں۔ لوگوں کی یہ ظاہر پرستی سخت تنقید کے قابل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عام رواۃ، حدیثوں کو بالمعنی بیان کیا کرتے تھے، الفاظ و حروف کے محفوظ رکھنے کا چنداں رواج نہ تھا۔ پس ادبی تصانیف میں جس طرح اہل ادب و بلاغت ایک ایک حرف کے تقدیم و تاخر اور اس کی وضع و ترتیب سے نکتہ آفرینیاں کیا کرتے ہیں، ویسا ہی تعمق متن حدیث میں برتنا، حتیٰ کہ ایک کلمہ کی تقدیم یا تاخیر، الفاظ کی نشست اور ناع اور واو جیسے حروف کے دقیق معنوی خصائص سے استدلال کا رخ متعین کرنا، جب کہ عام روایتیں بالمعنی بیان کی گئی ہیں ایک طرح کی لغویت اور الفاظ کی ناروا غلامی ہے۔ ورنہ تم دیکھتے ہو کہ ایک ہی روایت میں ایک راوی ایک لفظ استعمال کرتا ہے، اور بعینہ اسی روایت میں اسی سند کے ساتھ دوسرا راوی ایک دوسرے ہی لفظ کے ذریعہ حدیث کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے، نہ کہ اس کی غلط ترجمانی اور اس کے اشارات پر جا بجا حاشیہ اور وہیں تک اس کا تحقق ہو سکتا ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصول فہم و تدبر کے اجازت دے سکیں ورنہ اگر قائل کے کلام کا رخ کسی طرف ہو اور اس کا ترجمان و مفسر کوئی متعین کرے تو یہ تفسیر اور ترجمانی یا مقلدانہ تخریج نہ ہوگی بلکہ کوئی اور ہی چیز ہوگی۔

اس کے علاوہ ایسے فقہاء کو اس بات کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اصول کی ... کے جوش میں ایسی مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیا کریں جنہیں عام امت میں مقبولیت ... حاصل ہو چکی ہو۔ مثال کے طور پر حدیث مصراۃ کو لو، آنحضورﷺ نے فرمایا کہ:

"جو شخص ایسی بکری خریدتا ہے جس کا دودھ تھن میں پہلے سے روک لیا گیا تھا (تاکہ خریدار ... ہوئے میں آ کر زیادہ دام لگائے) تو اسے تین روز تک اختیار رہتا ہے، خواہ بکری رکھ لے یا ایک صاع گندم کے ساتھ واپس کر دے"۔

یہ حدیث متعدد طریق سے ثابت ہے اور ثقافت نے اس کی روایت کی ہے، لیکن احناف نے چونکہ یہ اصول وضع کر رکھا ہے کہ اگر راوی غیر فقیہ ہو اور اس کی روایت عام اصول کے مخالف ہو، اور کوئی عام قاعدہ نہ بنا سکتی ہو تو سرے سے وہ حدیث متروک العمل ہوگی، اس لئے باوجود صحیح اور مستند ہونے کے یہ حدیث ان کے نزدیک، متروک العمل ہے کیونکہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی اور راوی غیر فقیہ ہے۔

یہ طریقہ ارباب حق کا طریقہ نہ ہونا چاہیے۔ اس میں شریعت پر ایک طرح کی جسارت پائی جاتی ہے۔ فرمان رسالت کا احترام بہر حال انسانوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد کی رعایت سے بالاتر ہے۔ امام شافعیؒ نے اسی غلط روی سے بچانے کے لئے فرمایا ہے:

"جب میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے دوں یا کوئی اصول مقرر کروں پھر رسول اللہﷺ کا کوئی فرمان اس کے خلاف مل جائے تو میری رائے کالعدم سمجھو۔ رسول اللہﷺ کا فرمانا ہی اصل اصول ہے بقیہ سب ہیچ"۔ (جاری)

پاکستانی ثقافت

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری

تعریف ناقص ہی ہوتی ہے

ہر شے کی تعریف (Defination) الفاظ میں کرنا بس اسی حد تک ممکن ہے کہ اس چیز کا ایک دھندلا سا نقش ابھر کر سامنے آ جائے۔ تعریف سے کسی شے کو پہچاننے میں مدد تو مل سکتی ہے لیکن پہچان کا سارا دارومدار محض تعریف پر نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ان پڑھ شخص ایک چیز کی تعریف سے بالکل ناواقف ہو لیکن اس چیز کو پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہ ہو اور اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک آدمی کسی چیز کی تعریف تو کر دے لیکن جب وہ چیز اس کے سامنے آئے تو وہ اسے پہچان نہ سکے۔ جہاں تک مادی محسوسات کا تعلق ہے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ تجربے یا وجدان سے ایک شے بڑی آسانی کے ساتھ پہچان لی جاتی ہے۔ بچہ ''ماں'' کی منطقی تعریف سے قطعاً ناآشنا ہوتا ہے لیکن وہ اپنی ماں کو سب سے زیادہ پہچان لیتا ہے۔ ایک دہقانی بڑی آسانی سے کالی گائے اور کالی بھینس میں یا گھوڑے اور خچر میں تمیز کر لیتا ہے حالانکہ وہ دونوں کی امتیازی تعریف سے بالکل نابلد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک اہل علم کے سامنے آپ کسی نادیدہ شے کی نہایت جامع مانع تعریف کر دیں تو کوئی ضروری نہیں کہ جب وہ چیز پہلی بار آپ کے سامنے آئے تو آپ اسے فوراً پہچان بھی لیں۔

یہ تو مادی محسوسات کا حال ہے۔ اس سے زیادہ دشواری وہاں پیش آتی ہے جہاں محسوسات کی بجائے صرف ذہنی تصورات ہوں، اقدار ہوں یا مطلق (Absolute) قسم کی چیزیں ہوں۔ ہر دل میں کسی نہ کسی کی محبت ہوتی ہے لیکن محبت کی منطقی تعریف مشکل ہے۔ صاحب اولاد جانتا ہے کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے لیکن اس کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں کہ ایک بے اولاد شخص کو بھی اس کا احساس ہو جائے۔ ان اقدار کی صحیح شناخت میں تجربہ، وجدان، عقل وفہم وغیرہ سب ہی منطقی تعریف کے شریک و معین ہوتے ہیں۔

غرض تعریف بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ اس سے بہت کچھ مدد ملتی ہے لیکن شناخت کا سارا دارومدار اسی پر نہیں۔ یوں کہیے کہ اس سے پورا کام تو نہیں چل سکتا لیکن اس کی بغیر بھی کام

یں چلتا۔

اس دو گونہ دشواری کے اعتراف کے بعد اب آیئے ثقافت (Culture) کی طرف۔ اسلامی ثقافت کی کیا تعریف ہے؟ پھر پاکستانی ثقافت کیا ہے؟ نیز کسی ثقافت کی اصل محرک و عامل کیا شے ہے؟ ان سوالوں کو حل کرنے سے پہلے ہمیں یہ جاننا پڑے گا کہ خود ثقافت کیا چیز ہے اور اس کی کیا تعریف ہے؟ ثقافت دراصل ترجمہ ہے انگریزی لفظ کلچر کا۔ اور اس کی تعریف انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنسز اینڈ ایتھکس میں یوں ہے:

''یعنی دنیا اس لفظ کلچر اور اس کے فلسفے کے معاملے میں بیکن کی رہین منت ہے..... کلچر کا مفہوم اتنا وسیع ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف مظاہر اور متنوع صورتوں...... ذہنی، مذہبی اور اخلاقی..... سب پر حاوی ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت نے جہاں کہیں اپنے داخلی اور نفسیاتی پہلوؤں کو اور اپنے ارادہ اختیار کی گہرائیوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے وہی کلچر ہے''۔

(Encyclopaedia of Religions & Ethics p.359)

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقافت اتنی ہمہ گیر چیز ہے کہ انسانی زندگی کے تمام گوشے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ اس میں ایک قوم کا رہن سہن، لباس، خوراک، عبادات، شادی و مرگ کی رسومات، نشست و برخاست، معاملات حتیٰ کہ جنتری اور موسیقی اور تعمیراتی نقشے وغیرہ ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ اسی مفہوم کو بعض اہل لغت (Way of life of Nation) یعنی قومی اندازِ زیست سے تعبیر کرتے ہیں۔

عقیدہ و عمل کا باہمی ربط

اب سوال یہ ہے کہ کسی ثقافت کے عوامل کیا ہیں؟ یعنی اصل محرک کیا چیز ہے؟ وہ کونسی چیز ہے جو کلچر کی تخلیق کرتی ہے؟ اس تعریف سے بھی واضح ہے کہ ہر ثقافت کا محور کوئی عقیدہ ہوتا ہے۔ زندگی اور کائنات کے بارے میں جس قوم کا جو تصور ہوگا اسی تصور کے گرد اس کی ساری ثقافت گردش کرے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ عقیدہ کچھ اور ہو اور عمل کچھ اور۔ لفظ عقیدہ ہم عام رواج کے مطابق بول رہے ہیں۔ ورنہ اس کے لئے زیادہ صحیح لفظ ''ایمان'' ہے۔ انسان پہلے ایمان لاتا ہے

جو ہوتا ہی ہے بالغیب..... اس کے بعد ہی اس کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اگر عمل میں نقص ہو تو لازمی طور پر اسے ناقص ایمان ہی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایمان کے خلاف بھی عمل ہوتا ہے اور مثال یہ پیش کی جاتی ہے کہ چور چوری کو برا سمجھتا ہے اور اس کی برائی پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ چوری بھی کرتا ہے۔ لیکن گہرائی میں جا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی چوری بھی اس کے کسی ایمان ہی کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف اس کا ایمان بظاہر یہ ہے کہ چوری بری چیز ہے لیکن دوسری طرف اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر چوری نہ کروں گا تو بھوکا مر جاؤنگا۔ یہ دوسرا عقیدہ اس کے دل و دماغ پر اتنا چھایا ہوا ہوتا ہے کہ چوری کی برائی پر اس کا جو ایمان ہے وہ دب کر رہ جاتا ہے۔ چوری کے وقت تو اس کا یہ ایمان..... کہ چوری بری چیز ہے..... گویا ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مضمون ہے جسے ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے ''زانی زنا کے وقت مومن نہیں ہوتا''۔ اگر انسان کا یہ عقیدہ (ایمان و یقین) ہو کہ یہ سنکھیا کی ڈلی ہے تو وہ کبھی اسے نہیں کھائے گا۔ یا اگر کھائے گا تو مرنے کے ارادے سے اور اس یقین کے ساتھ کہ اس سے موت واقع ہوگی۔

غرض انسان کے اعمال و وظائف ہمیشہ کسی عقیدے یا ایمان ہی کے گرد گردش کرتے ہیں اور یہی ایمان و عقیدہ ہے جو کلچر کی تخلیق کرتا ہے ثقافت دراصل مظاہر ہیں عقیدہ و ایمان کے۔ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے حرکت و سکون پر کوئی اعتقادی تصور ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ جس شخص کا عقیدہ آواگون پر ہوگا وہ لازماً ایک طبقے کو پیدائشی اعلیٰ اور دوسرے کو پیدائشی ادنیٰ سمجھے گا اور چھوت چھات کا عمل اس سے صادر ہوگا۔ لیکن جس کا یہ عقیدہ نہ ہو وہ ایسی تفریق کو اپنے عمل سے ظاہر نہ ہونے دے گا۔ اسی طرح جس قوم کے افراد کا عقیدہ وطن، نسل، زبان، رنگ یا پیشے پر ہوگا اس قوم کی قومیت کی بنیاد بھی یہی چیزیں ہونگی اور وہ زندگی کے تمام اعمال و وظائف کو اسی عینک سے دیکھے گی، اور اسی کسوٹی پر کسے گی۔ اس کے افراد کے تمام حرکات و سکنات پر یہی عقیدہ اثر انداز ہوگا اور اس کے کردار و عمل کے تمام گوشے اسی عقیدے کے مظاہر ہونگے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا انداز زیست کچھ اس نوع کا ہو جائے گا کہ اس کے معمولی معمولی اعمال سے یہ علم ہو جائے گا کہ یہ فلاں قوم یا ملک سے تعلق رکھنے والا فرد ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ جس طرح کسی شخص کو

اس کی تیلیوں سے چاول کھاتے دیکھ کر آپ فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ چینی قوم کا فرد ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چھینک کر الحمد اللہ کہے تو آپ بلا تامل یہ فتوے لگا دیں گے کہ یہ مسلمان قوم کا فرد ہے۔ یوں ہی آپ کسی کا لباس دیکھ کر، کسی کا طریقہ عبادت دیکھ کر، کسی کا رہن سہن دیکھ کر اور کسی کا کھانا دیکھ کر بخوبی یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا فلاں قوم سے تعلق ہے یا نہیں ہے۔

عقیدہ و ثقافت میں وہی نسبت ہے جو بیج اور درخت میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تخم یکساں نظر آئیں لیکن درخت بننے کے بعد دونوں کی شکل رنگ، مزے، خاصیت وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں بیجوں کے اندر صلاحیت جداگانہ ہے اور انہی صلاحیتوں کو دونوں تخم جداگانہ شکل بخشتے ہیں۔

یوں تو آپ ایک سیاہ فام موٹے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں، گھونگریالے بال دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حبشی قوم کا فرد ہے لیکن اس کا شمار کسی کلچر میں نہیں، کیونکہ یہ باتیں کسی عقیدہ و تصور کے تحت نہیں ہوتیں بلکہ یہ قدرتی آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے۔ اصل ثقافت وہی ہے جس کا آغاز کسی تصور یا عقیدے سے ہوا ہو اور وہ اختیاری ہو۔ اختیاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی اعتقادی، معاشی، سیاسی، ملکی، قومی وغیرہ ضرورت سے بالا ارادہ اختیار کیا گیا ہو۔ ایسی اختیاری چیزیں آگے چل کر ایسا جز و زندگی اور عادت ثانیہ بن جاتی ہیں کہ ان پر گویا بلا ارادہ عمل ہوتا ہے۔ اور اس وقت اسے شاذ و نادر ہی خیال آتا ہے کہ ان چیزوں کا خالق فلاں تصور ہے۔

قوم کی قدر مشترک

یوں تو ہر شخص کا ارادہ، خیال اور پسند وغیرہ شکل وصورت کی طرح جدا جدا ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ان افراد کے انداز زیست میں ایک یکسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ یکسانی کی یہ قدر مشترک اس طرح کی ہوتی ہے جو اس قوم کو دوسری قوم سے ممتاز بھی کر دیتی ہے۔ یہی چیز دراصل کسی قوم کا کلچر ہوتی ہے اسے محض تعریفوں (Definition) سے نہیں بلکہ بیشتر اسے وجدانی طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جس طرح گھوڑے اور خچر میں وجدانی طور پر تمیز کر لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی منطقی استدلال ہو۔ بلاشبہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو دنیا کی مختلف قوموں میں مشترک ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں ایسی بھی ملیں گی جو ایک

قوم کو دوسری سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ اگر رنگ میں یکسانی ہے تو زبان میں فرق ہوگا، لباس میں، کھانے میں، طرز معاشرت میں، مزاج میں، ادب میں، بنیاد قومیت میں، مذہبی تصورات میں، غرض کہیں نہ کہیں یہ فرق ضرور محسوس ہو جائے گا۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ثقافت (Culture) اور تمدن (Civilization) کی سرحدیں بہت ملتی ہوئی ہیں۔ تمدن بھی دراصل انہی مظاہر کا نام ہے جنہیں ہم ثقافت کہتے ہیں۔ فرق..... یہ ہے کہ ثقافت کی تخلیق تصور وعقیدہ کرتا ہے اور تمدن کو مادی ضروریات زندگی وجود میں لاتی ہیں۔ ایک پہیے سے لے کر بھاری مشینوں تک ہر چیز تمدن کا مظہر ہے۔ لیکن ثقافت سے اس کا زیادہ تعلق نہیں۔

اسلامی ثقافت

ثقافت کی اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی ثقافت کیا ہے؟ اسلامی ثقافت کوئی ایسی متعین شے نہیں جو ہر ملک کے مسلمانوں میں ہر لحاظ سے یکساں ہو۔ اسلام رنگ، نسل، وطن، زبان اور پیشے پر اپنی قومیت کی بنیاد نہیں رکھتا۔ اس کی اساس ایک تصور (Ideology) پر ہے۔ جو بھی اسے قبول کر لے وہ مسلمان ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی زبان، کسی پیشے، کسی نسل، کسی وطن اور کسی رنگ سے ہو۔ اسلام ان تمام اختلافات کے ہوتے ہوئے سبھوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ ان بنیاد ہائے خمسہ (رنگ، نسل، وطن، زبان، پیشہ) کے جو فطری تقاضے ہیں وہ یقیناً اپنے پیچھے کچھ روایات رکھتے ہیں یا کچھ معاشی و سیاسی و ملکی مقتضیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اسلام ان میں رد و بدل کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس اتنا چاہتا ہے کہ ان سب کو ایک خاص زاویہ نظر کے تحت رکھا جائے۔ اس کے لئے ان نے کچھ ہدایات دے دی ہیں مثلاً:

(۱) غذاؤں میں حلال وحرام کا لحاظ رکھا جائے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ عرب روٹی کھاتے ہیں لہٰذا چاول اور کیک نہ کھاؤ۔

(۲) لباس میں ستر پوشی، پاکیزگی اور جمال ملحوظ رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ چوغہ ضرور پہنو، کوٹ نہ پہنو۔

(۳) زبان کو غیر مشروع عناصر سے پاک رکھا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ عربی ہی بولو۔

(۴) جنگ اسلامی اقدار کے مطابق کرو۔ یہ لازمی نہیں کہ بندوق نہ استعمال کرو وغیرہ

وغیرہ۔

اسلام ان تمام ثقافتی اختلافات کو گوارا کرتا ہے اور مسلمان مسلمان ہونے کے باوجود چینی مسلمان، ترکی مسلمان، پاکستانی مسلمان ہوسکتا ہے۔ ان سب کی ملکی ثقافتیں الگ ہوسکتی ہیں لیکن ذہن اور زاویہ نظر (Attitude) ایک ہی ہونا چاہیے۔ اسلام دوسری ثقافتوں میں صرف اتنا دخل دیتا ہے:

۱۔ جو مضر باتیں ہوں ان کو ترک کر دیا جائے۔

۲۔ جب تک مفید مفید ہے اسے باقی رکھا جائے اور جب تک مضر مضر ہے اسے متروک رکھا جائے۔

ان شرائط کے ساتھ جس قوم و ملک میں جو بھی ثقافت ہے وہ عین اسلامی ثقافت ہوگی۔ خواہ دوسرے ملک وقوم سے وہ مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ ان اختلافات سے نفس اسلامی ثقافت پر کوئی اثر اس لئے نہیں پڑتا کہ ان اختلافات کے ساتھ بے شمار دوسرے عناصر ثقافت میں اتحاد بھی ہے۔ ہر ملک وقوم کا مسلمان ایک ہی طرح نماز ادا کرے گا۔ ایک ہی طرح حج کرے گا، ایک ہی طرح زکوۃ دے گا، ایک ہی ماہ میں روزے رکھے گا، لحم خنزیر کوئی نہیں کھائے گا، مردار کوئی نہیں استعمال کرے گا، عریاں رہنا کوئی نہیں پسند کرے گا، بتوں کی کوئی بھی نہیں پرستش کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ ان بنیادی باتوں میں کامل اتحاد ہوگا۔ اگرچہ بعض جگہ بہت معمولی سا اختلاف بھی ہوگا۔

غرض اسلامی ثقافت اختلاف واتحاد کی جامع ہے۔ بنیادی اتحاد اور فروعی اختلاف دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی ثقافت ہر وہ ثقافت ہے جو (دوسری ثقافتوں سے بعض باتوں میں متحد ہونے کے باوجود) دوسری قوم سے ممتاز کر دے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمان مصری ایک عیسائی مصری سے لباس میں بظاہر ممتاز نہ ہوسکے۔ لیکن تھوڑی دیر کی صحبت میں دونوں سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوگی جو ان کو ایک دوسرے کی قومیت سے الگ کر دے۔ اسلامی ثقافت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ الف سے ی تک ہر بات میں غیر مسلم کلچر سے جدا ہو، کچھ چیزیں مشترک ہوں گی اور کچھ جداگانہ۔ ہر کلچر کا یہی حال ہے۔ اس میں کچھ

باتیں دوسرے کلچر کی ہوتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ہر ثقافت کا خالق کوئی خاص تصور ہوتا ہے۔ اسلامی کلچر کے پس پردہ بھی ایک عقیدہ و تصور ہے اور وہ ہے خدا پرستی یا **لا الہ الا اللہ** پر ایمان۔ اس تصور کی جڑ سے جو شاخ بھی نکلے گی وہ عین اسلامی ثقافت کی حامل ہو گی خواہ کسی دوسری ثقافت کی شاخ سے ہم شکل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ہر کلچر میں کھپ سکتا ہے بشرطیکہ اس ثقافت کا کوئی جز اس کے مزاج کے خلاف نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اسلام اسے بدل دے گا اور اس کی جگہ اپنی اقدار کو رکھ دے گا۔

پاکستانی ثقافت

اس گفتگو کے بعد اب تیسرے سوال کی طرف آیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ پاکستانی ثقافت کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو یہ سوال ذرا قبل از وقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی کلچر ابھی بنا ہی نہیں ہے بلکہ اب بننا شروع ہوا ہے۔ کسی قوم کی ثقافت ایک دو دن میں نہیں بنا کرتی۔ قرنوں میں بنتی ہے۔ پاکستان کو بنے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ ابھی تک اس کا کلچر تقریباً وہی ہے جو متحدہ ہندوستان کا تھا۔ ہندوستان پہلے ہی سے مختلف تہذیبوں کا مجموعہ تھا۔ بیسیوں زبانیں، بیسیوں لباس، بیسیوں غذائیں، بیسیوں مذہب، بیسیوں طرز معاشرت، بھانت بھانت ثقافتوں کا مجموعہ پہلے ہی تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اس میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا۔ پاکستان میں اب بھی وہی شکل ہے۔ جس طرح ایک افغانی کے لباس، زبان، تہذیب وغیرہ کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ افغانی قوم کا فرد ہے اس طرح ایک پاکستانی کو دیکھ کر فی الفور پاکستانی سمجھ لینا دشوار ہے۔ اگر جناح کیپ نہ ہو تو اس میں اور ایک ہندوستانی میں بہ مشکل ہی فرق کیا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام مسلمان ممالک کے کلچر کو ہم اسلامی ہی کلچر کہیں گے لیکن افغانستان کا کلچر افغان اسلامی کلچر ہو گا۔ مصر کی اسلامی ثقافت مصری اسلامی ثقافت ہو گی۔ **ھلم جرا**۔ یہ سب تہذیبیں معلوم کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن "پاکستانی اسلامی ثقافت" ابھی اس مرحلے پر نہیں پہنچی ہے جو ہمیں دوسرے اسلامی ممالک کی ثقافت کی طرح ممتاز کر سکے۔

اس وقت مشرقی پاکستان میں کچھ ثقافتی ہم آہنگی موجود ہے لیکن مغربی پاکستان میں سابق

سندھی، پنجابی، سرحدی فروق نمایاں ہیں۔ یہ تمام فرق اپنی جگہ پر ہیں۔ اس میں چنداں ہرج نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ ضروری ہے کہ مملکت پاکستان کا ایک ایسا کلچر بھی ہو جو ان سب میں مشترک ہو۔ اس کے بغیر پاکستانی قوم کا امتیاز پیدا ہونا مشکل ہے۔ ہماری ایک مشترک زبان ہونی چاہیے جو اپنی گوناگوں خصوصیات اور ہمہ گیری کی وجہ سے سارے پاکستانیوں کے لئے قابل قبول ہو۔ مثلاً وہ تمام دوسری زبانوں کے ضروری الفاظ کو اپنے اندر اس طرح جذب کر سکے کہ اس کو ادا کرنے میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ پاکستان کے مختلف اطراف میں سمجھی، بولی اور لکھی جاتی ہو۔ اس میں مختلف علوم وفنون بالخصوص اسلامی علوم کے ذخیرے موجود ہوں۔ اور وہ ہماری دینی کتاب "قرآن مجید" کی زبان سے قریب تر ہو۔ الفاظ اور ادائیگی کے لحاظ سے بھی اور رسم الخط کے لحاظ سے بھی۔ مزید براں اس میں ایسی صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ تمام علمی، ادبی اور فنی ترقیوں کا آسانی سے ساتھ دے سکے۔ یہ ضرور ہے کہ ایسی مشترک زبان کو اپنانے کے بعد اس میں بہت سی لسانی سہولتیں بھی پیدا کرنی پڑیں گی کہ وہ پاکستان کی مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، عربی، فارسی وغیرہ کے الفاظ، تلفظ، محاورات اور ترکیبوں کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اپنے اندر سمو کر جذب کرلے۔ اسی طرح لباس میں بھی یکسانی ہونی چاہیے۔ اس میں ہمیں اتنا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ لباس ایسا ہو جو ہر امیر غریب کو آسانی سے میسر آ سکے۔ موسمی اثرات کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اپنی زینت کے لحاظ سے دیدہ زیب ہو۔ شرعی لحاظ سے ستر پوش ہو اور اس میں اتنا تکلف نہ ہو کہ بعض دینی مناسک ومراسم ادا کرنے میں دشواری پیش آئے۔ پاکستانی مملکت کی مختلف ثقافتوں کو گھل مل کر ایک نئی اسلامی تہذیب جنم دینا چاہیے جو پاکستان کی مشرقی ومغربی ثقافتوں کو بھی ملا دے۔ اور دوسری قوموں کی طرح ہماری ثقافت بھی ہر جگہ بآسانی پہچان لی جا سکے۔ یہ کیا ثقافت ہے کہ ایک ہی گھرانے میں پتلون، شلوار، پاجامہ اور دھوتی سب کچھ ایک ساتھ چل رہا ہے اور ایک ہی محلے میں اردو، پشتو، سندھی، پنجابی، بنگالی سب ہی زبانیں اس طرح بولی جا رہی ہیں کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس قوم کی کوئی مشترک تہذیب اور قومی زبان بھی ہے۔

(یہ مقالہ سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے کا ہے)

مغرب نے عورت کو کیا دیا؟

سید جلال الدین عمری

تاریخ کے ایک طویل عرصہ سے عورت مظلوم چلی آ رہی ہے۔ وہ ہر قوم میں اور ہر خطہ میں مظلوم تھی۔ یونان میں، مصر میں، عراق میں، ہند میں، چین میں، عرب میں ہر جگہ اس پر ظلم ہو رہا تھا۔ بازاروں اور میلوں میں اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ حیوانوں سے بدتر اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ یونان میں عرصہ تک یہ بحث جاری رہی کہ اس کے اندر روح ہے بھی یا نہیں؟ اہل عرب اس کے وجود ہی کو موجب عار سمجھتے تھے۔ بعض شقی القلب اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، ہندوستان میں شوہر کی چتا پر اس کی بیوہ جل کر راکھ ہو جاتی تھی۔ راہبانہ مذاہب اسے معصیت کا سرچشمہ، گناہ کا دروازہ اور مجسم پاپ سمجھتے تھے۔ اس سے تعلق کو روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا جاتا تھا۔ دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں اس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، وہ حقیر اور ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اس کے معاشی اور سیاسی حقوق نہیں تھے۔ وہ آزاد مرضی سے لین دین اور کوئی مالی تصرف نہیں کر سکتی تھی۔ وہ باپ کی پھر شوہر کی اور اس کے بعد اپنی نرینہ اولاد کی تابع اور محکوم تھی۔ ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی اسے اجازت نہ تھی۔ ان کے ظلم و ستم پر اس کی کہیں دادرسی نہ ہوتی تھی۔ اسے فریاد کا بھی حق حاصل نہ تھا۔

اس میں شک نہیں بعض اوقات عورت کے ہاتھ میں زمام اقتدار بھی رہی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ سلطنت اور حکومت اس کے اشاروں پر گردش کرتی رہی ہے۔ یہ تو بہت دیکھنے میں آیا کہ خاندان اور قبیلہ پر وہ چھائی ہوئی تھی۔ بعض غیر متمدن قبائل میں عورت کو مرد پر ایک طرح کی بالا دستی بھی حاصل رہی ہے اور اب بھی اس قسم کے قبائل موجود ہیں لیکن اس کے باوجود بہ حیثیت نوع عورت کے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا وہ مظلوم کی مظلوم ہی رہی۔ اس کے حقوق پر دست درازی جاری رہی۔

اسلام نے عورت کو ظلم کے اس گرداب سے نکالا، اس کے ساتھ انصاف کیا، اسے انسانی حقوق دیئے، عزت و سربلندی بخشی اور معاشرہ کو اس کا احترام سکھایا۔ لیکن مغرب کی جو قومیں اسلام کے سایہ رحمت میں نہ آ سکیں وہ اس کے برکات و ثمرات سے محروم رہیں۔ ان میں عورت

کے حقوق بدستور پامال ہوتے رہے اور وہ ہر طرح کا ظلم سہتی رہی۔ موجودہ دور میں جب ان کے اس کا ردعمل ہوا تو عورت کی آزادی اور مساوات کا تصور ابھرا۔ اس کے حق میں دلائل قوموں میں اس کا ردعمل ہوا... دیے گئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نوعی اختلاف کے باوجود عورت مرد سے فروتر نہیں ہے۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر ہیں ان میں کسی پہلو سے فرق و امتیاز صحیح نہیں ہے۔ وہ ہر کام کرسکتی ہے، ہر عہدہ و منصب کی اہل ہے۔ وہ ہر طرح آزاد ہے، لہٰذا مرد کی بالا دستی اس پر سے ختم ہونی چاہیے اور اسے وہ سارے حقوق ملنے چاہئیں جو مرد کو حاصل ہیں۔

عورت کے لئے یہ بڑا دل خوش کن تصور تھا۔ اس نے لپک کر اسے اس طرح قبول کیا جیسے فردوس گم گشتہ اسے مل گئی ہو۔ وہ اس کے ظاہری حسن پر فریفتہ ہوگئی اور اس کے باطن میں چھپی ہوئی خرابیوں پر غور نہ کرسکی۔ حالانکہ یہ بعض پہلوؤں سے اس کے حق میں مفید تھا تو بعض پہلوؤں سے نقصان دہ بھی تھا۔ اس میں ایک طرف عورت کو مرد کے ظلم سے نجات دلائی گئی تھی تو دوسری طرف اس کی قوت و صلاحیت، مزاج اور نفسیات کی قطعاً کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی۔ یہ درحقیقت مرد کے ظلم کے خلاف ایک شدید ردعمل تھا۔ اس میں وہ ساری بے اعتدالیاں موجود تھیں جو اس طرح کے ردعمل میں بالعموم پائی جاتی ہیں۔

عورت کی آزادی کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کے بغیر اسے معاشی ترقی اور استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیشہ مرد کی دست نگر رہے گی اور سماج میں فروتر سمجھی جائے گی۔ اس لئے یہ اس کا ایک فطری حق ہے کہ وہ اپنی معاشی حیثیت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے آزادی سے دوڑ دھوپ کرے، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور ملکی انتظام و انصرام میں مرد کی طرح حصہ لے۔ اس کے نتیجہ میں عورت اور مرد کے کام کے دائرے جو الگ الگ تھے ایک ہوگئے اور عورت معاش کے میدان میں مرد کے ساتھ تگ و دو میں مصروف ہوگئی۔

یہاں اس حقیقت کو نظر انداز کردیا گیا کہ عورت ایک کم زور اور نازل صنف ہے۔ وہ سخت اور محنت طلب کام انجام نہیں دے سکتی۔ اس پر ان کاموں کا بوجھ ڈالنا بہت بڑی زیادتی ہوگی، جن کے اٹھانے کے لئے وہ جسمانی اور دماغی لحاظ سے کسی طرح فٹ نہیں ہے۔ وہ جب تک جوان رہتی ہے۔ حمل، رضاعت، حیض اور نفاس کی تکلیفیں اسے برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے اس

کی صحت غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے اور اس کی قوت کارگھٹ جاتی ہے۔ ان مراحل سے پوری جوانی میں اسے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مراحل جب طے ہوتے ہیں تو وہ جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کی قوتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں۔ موجودہ دور اس معاملہ میں عجیب تضاد کا شکار ہے۔ وہ زبان سے تو اسے ہر کام کا اہل قرار دیتا ہے لیکن عمل کی دنیا میں اسے صنف نازک مان کر معاملہ کرتا ہے۔ ہلکے پھلکے کام تو اس سے لئے جاتے ہیں اور پیچیدہ اور دقت طلب کاموں کے لئے اسے مناسب تصور نہیں کیا جاتا چنانچہ آج وہ زیادہ سے زیادہ دوکانوں پر سودا فروش (Sales Woman) ہے۔ کہیں کلرک ہے، کسی کی سیکرٹری ہے، کسی جگہ ٹائپسٹ ہے، بہت ترقی کی تو ٹیچر ہے، نرس ہے ڈاکٹر ہے۔ اس کے برخلاف فوج میں اس کا وجود نہیں ہے۔ بھاری مشینیں اس کے حوالہ نہیں کی جاتیں پر خطر مہمات کے لئے اس کا انتخاب نہیں ہوتا۔ وہ پائلٹ اور کپتان نہیں ہے۔ بھاری گاڑیاں وہ نہیں چلاتی، حتیٰ کہ نازک آپریشن کے لئے بھی مرد کی تلاش ہوتی ہے۔ اس کی قوت کار مرد کے مقابلہ میں کم سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کم از کم پرائیویٹ اداروں میں اس کی تنخواہ مرد سے کم ہوتی ہے۔ یہ حال ان ممالک کا بھی ہے جہاں ایک ہی کام کے لئے عورت اور مرد کی تنخواہ میں فرق کرنا قانوناً جرم ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس سب کے باوجود عورت کی معاشی حالت پہلے سے بہتر ہے اور وہ خود کفالت اور معاشی استحکام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے لئے اسے بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔

۱۔ اس کے لئے اسے اپنی قدر و قیمت گھٹانی پڑی اور اپنا احترام اور وقار کھو کر مرد کے لئے حصول دولت کا ایک سستا ذریعہ بننا پڑا۔ آج تجارت اور صنعت و حرفت پر مرد کا قبضہ ہے، بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ بازار اور منڈی اسی کی ہے۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے ہوٹل، کلب اور سینما گھر کا مالک وہی ہے۔ اس طرح سارے وسائل دولت اس کے پاس ہیں اور عورت اس کے پھیلے ہوئے کاروبار کو فروغ دینے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ مرد اپنی تجارت کو بڑھانے اور اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لئے اسے استعمال کر رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہزاروں روپیہ کی کوئی چیز ہو یا دو پیسے کی عورت کی پرکشش اور دل لبھانے والی تصویر اس پر

...موجود ہوگی۔ بات صرف اشتہار کی حد تک نہیں رہی بلکہ عورت کو بازار میں اسلئے اٹھایا گیا کہ ... اپنے ناز و ادا سے مرد کی تیار کردہ مصنوعات کو فروخت کرے۔ اس کے قائم کردہ ہوٹلوں اور ... میں مہمانوں کا استقبال، خاطر تواضع اور خدمت کرے۔ اس کے سینما ہالوں میں تھرک تھرک کر اپنے جسم کے پیچ و خم کی نمائش کرے اور اس کے لئے وقت ضرورت نیم عریاں ہی نہیں پوری طرح برہنہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اپنی معاش کی خاطر شاید اس طرح کبھی ذلیل و رسوا نہ ہوئی ہوگی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے رمیان جذبہ محبت رکھا ہے۔ موجودہ دور میں یہ جذبہ ختم ہو گیا اور اس کی جگہ حریفانہ جذبات پرورش پانے لگے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ... میں دونوں کا مقابلہ ہونے لگا اور ہر ایک نے دوسرے کو پیچھے ہٹانے اور خود آگے بڑھنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن یہ ایک طاقت ور صنف اور ایک کمزور صنف کا مقابلہ تھا۔ مرد اپنی قوت و صلاحیت کی وجہ سے آگے رہا اور عورت اس کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ زمانہ قدیم کی طرح آج بھی قوموں کی قیادت و سیادت مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اہم عہدوں اور مناصب پر اسی کا قبضہ ہے، زندگی کی سارے شعبوں پر وہی چھایا ہوا ہے۔ عورت اس کے آگے کیا سکتی اس کی ہمسری کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتی۔ چند شاذ و نادر مثالوں سے اس کی تردید نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس طرح کی مثالیں ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ دور حاضر ہی کی ساتھ یہ مخصوص نہیں ہے۔ (جاری)

☆☆☆

☆ نوشہرہ ورکاں کے بھائی فیض الحسن اور چوہدری محمد اشفاق صاحب رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔

☆ ملتان کے بھائی ناصر عباس شاہ کی بڑے بھائی وفات پا گئے ہیں۔

☆ گوجرانوالہ کے بھائی محمد طالب صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

(تمام برادران کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں)

کیا پاکستان میں سچائی کمیشن کا قیام ممکن ہے

کے۔ ایم اعظم

گذشتہ سال کے دوران میں کئی ایک مشہور زمانہ ملکی شخصیتوں نے پاکستان میں ایک سچائی کمیشن کے قیام پر زور دیا ہے۔ بے شک جب تک ہم سچائی کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہ ہونگے، ہم تاریخ سے کوئی بھی سبق حاصل نہ کر پائیں گے۔ سچ کو چھپا کے ہم اپنی غلطیوں کا ازالہ نہ کر پائیں گے۔ ہمارے عوام بھی سچ کو جاننا چاہتے ہیں اور یہ مفروضہ کہ سچ ہمارے قومی مفادات کو گزند پہنچا سکتا ہے، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

محترم وزیر اعظم محمد نواز شریف نے ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ء کو ڈھاکہ میں فرمایا تھا کہ اگر ۱۹۷۰ء کے قومی انتخابات کے نتائج کا احترام کیا جاتا تو اس خطہ کی تاریخ مختلف ہوتی۔ کاش وہ یہ بھی کہہ دیتے کہ اگر ۱۹۶۲ء کے صدارتی انتخاب میں دھاندلی نہ ہوتی تو اس خطہ کی تاریخ اور بھی مختلف ہوتی۔ اس تقریر کے ایک ہفتہ بعد کراچی میں انہوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا تھا کہ حکومت ان لوگوں کو، جنہوں نے پاکستان کی سالمیت و استحکام کو نقصان پہنچایا ہے، کیفر کردار پہنچا کر دم لے گی۔ میرے خیال میں یہ پہلی بار ہے کہ ایک سربراہ حکومت نے اس نہایت ہی اہم موضوع پر اتنا بے باک اظہار خیال کیا ہے۔ مگر اظہار خیال اور بات ہے اور مثبت عمل دوسری بات ہے۔ عوام ہمارے قومی لیڈروں کے بلند بانگ مگر کھوکھلے نعروں سے بیزار نظر آتے ہیں اور ان کو اپنے اکابرین پر اعتماد نہیں رہا جب کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے سب سے بڑے چور ہی احتساب کا نعرہ بلند کر رہے ہیں، بدچلن ہی ایمانداری کی تلقین کر رہے ہیں اور ظالم ہی انصاف کی پکار لگا رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ دانشوروں کے اصلاحی ٹولوں میں بھی یہی طبقہ پیش پیش ہوتا ہے۔ جن افراد نے ہر موقعہ پر اپنی قیمت وصول کی ہے، وہی خودی اقبال پر گوہر افشانی کرتے نظر آتے ہیں۔

قیام حق کے لئے ہمیں ان غلط مفروضوں سے بھی نجات پانی ہوگی جو ہمارے ہاں رائج ہیں

...تقسیم ملک کے وقت ہم ایک ایماندار اور منظم قوم تھے۔ بے شک ہم نے ایک کرشماتی لیڈر
... قیادت میں یہ ملک تو حاصل کر لیا مگر ملک ملتے ہی ہم اپنے اپنے گروہی مقاصد اور ذاتی
... کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ ہماری کہانی کسی عظیم قوم کے ناگہانی زوال کی روداد نہیں بلکہ ایک
... مسلسل گراوٹ کی کہانی ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں نے پاکستان کو ایک ذاتی شکارگاہ
... زیادہ درجہ نہ دیا اور بس یہی سمجھا کہ اب ان کو لوٹ مار کے لئے ایک قانونی جائے پناہ مل گئی
... ستمبر اکتوبر ۱۹۴۷ء کے دوران مشہور دینی سکالر علامہ محمد اسد کے ریڈیو پاکستان، لاہور سے
... گئے سات خطابات پاکستانیوں کی اخلاقی گراوٹ کی ایک دردناک تصویر پیش کرتے
...

ہمارا دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمیں بہترین سیاسی، عدالتی اور انتظامی نظام
... ورثے میں دیا تھا، جس کے ہم نے چند سالوں میں ہی پرخچے اڑا دیئے۔ ہر آنکہ یہ نظام ایک
... مرانی حکومت کی ضروریات احسن طریقے سے پوری کر رہا تھا، مگر یہ ایک نئی آزاد ریاست کے
... لئے قطعی ناموزوں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی نظام ہمارے نوآبادیاتی دور میں ایک بڑی
... حد تک لوگوں کو سکھ چین اور انصاف مہیا کر رہا تھا۔ نوآبادیاتی دور میں ریاست نہایت طاقتور تھی اور
... رعایا پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور وہ اس کو کسی حد تک ہی سیاسی سرگرمیوں میں شمولیت کی
... اجازت دیتی تھی۔ مگر افسوس کہ آزادی کے بعد بھی ہماری ریاست نے قومی سیاسی اداروں کو پھلنے
... پھولنے کا موقعہ نہ دیا ہے۔ چنانچہ یہ ادارے بتدریج ذاتی اور گروہی مفادات اور قومی قیادت کے
... فقدان کا شکار ہو گئے جب کہ دوسری طرف ریاست، جس کے سر سے تاج برطانیہ کا چھترا اٹھ گیا
... اپنے اہل کاروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنا روایتی مقام اور تقدس کھو بیٹھی۔ چنانچہ
... پاکستان میں جب کہ ریاست نے سیاسی اداروں کو پنپنے کا موقع نہ دیا، وہاں سیاسی انحطاط نے
... ملکی وقار کو بے آبرو کر دیا۔

ہماری نوزائیدہ ریاست کے کرتا دھرتا ہمارے انگریز نوکر تھے، جو ظاہراً ہمارے ہمدرد بنے
... ہوئے تھے مگر دراصل ہمارے دشمن تھے۔ صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن اکیلا ہی ہمارا دشمن نہ تھا۔ جنرل

گریسی نے حضرت قائداعظم کو کشمیر میں فوج داخل کرنے کا حکم ماننے سے تو اس لئے انکار کر دیا کہ
پہلے جائنٹ سپریم کمانڈر آکینلک سے اجازت لینا پڑے گی۔ کوئی پوچھے کیا بھارتی فوج کو
''مشکوک الحاق'' سے پہلے ہی کوچ کرنے کا حکم اکینلک سے پوچھ کے دیا گیا تھا؟۔ مگر ہمیں
انگریزوں سے بھی زیادہ نقصان ان بے کردار اور ابن الوقت ہم وطنوں نے پہنچایا ہے، جن کی
کھیپ انگریز انیسویں صدی سے تیار کر رہے تھے۔ انگریزوں کی تیار کردہ اس کھیپ میں سکندر
مرزا، برادران عزیز احمد و جی احمد، غلام محمد، مشتاق احمد گورمانی، چوہدری محمد علی، ملک فیروز خان
نون، نواب مظفر علی قزلباش اور نوابزادہ ممتاز دولتانہ جیسے معززین شامل ہیں جب کہ دوسرے
درجے پر سرکاری ملازموں کا ایک جم غفیر، کالے انگریزوں کی شکل میں ہمارے حکمران بن گئے اور
اب تک ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے اس اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا صدر، آنریری میجر جنرل
سکندر مرزا میر جعفر کا پوتا نہیں تھا کہ بلکہ نواب مرشد آباد کے مطلقہ ایرانی بیوی سے بنگال اور بہار
کے ایک انگریز گورنر، جو بعد میں وائسرائے ہند بنا کی ناجائز اولاد تھا۔ اس کا ریکارڈ سرحد کی سپیشل
پولیس کے پاس موجود تھا۔

انگریزوں کو معلوم تھا کہ افواج پاکستان میں کچھ غیرت مند لوگ موجود ہیں۔ انہوں نے
راولپنڈی سازش کا شوشہ کھڑا کر کے ہماری افواج کو نہایت ہی قابل اور دلیر کمانڈروں سے محروم
کر دیا جب کہ دینی ذہن رکھنے والے افسران کو کھڈے لائن لگا کر اوپر جانے سے روک دیا۔ جو رہ
گئے وہ بس دوسرے درجہ کا مال تھا۔ ۱۹۴۴ء کے آخری ایام میں برہما محاذ پر ڈویژن کمانڈر جنرل
ریس نے ایوب خاں کی کرنیلی توڑ کر بطور میجر واپس دہلی روانہ کر دیا کہ یہ آدمی لڑاکا پلٹن کی کمانڈ
کے قابل نہیں ہے۔ انگریزوں نے اعظم خان کو میجر بناتے وقت اس کی فائل پر لکھا تھا ''ناٹ فار
کمانڈ'' چنانچہ موصوف نے پوری دوسری جنگ عظیم ایک تفریحی کمپنی کی کمانڈ میں گزار دی۔ مگر
حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ پاکستان میں یہی ایوب خان فیلڈ مارشل کے جلیل القدر عہدے
تک پہنچے جب کہ ان کے دوست اعظم خان لیفٹننٹ جنرل کے اعلیٰ عہدے پر براجمان ہوئے۔
میجر جنرل افتخار خان، جنہیں شاید ہماری بری افواج کا پہلا پاکستانی سربراہ بننا تھا بھی ایک کھوئے

سکے تھے۔ ان کا مفروضہ یہ تھا کہ ہم ہندوستان سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یہ حضرت زندہ رہتے تو ایوب
خان سے ہرگز بہتر نہ ہوتے۔ ایوب خان میں تو مروت و اخلاق تھا جب کہ یہ صاحب ان سے
زیادہ عاری تھے اور ان کی بیوی غیر مسلم تھی۔ اپنے اس ڈویژن کمانڈر کے حکم پر فروری، مارچ
۱۹۴۸ء میں سیالکوٹ کے علاقہ میں مجاہدین پر مکمل جھاڑو پھیرنے والے بریگیڈیر محمد موسیٰ کو بری
افواج کی سربراہی عطا ہوگئی۔ **(فاعتبروا یااولی الابصار)**

ہماری قوم پچھلے پچاس سالوں سے اللہ جل جلالہ اور رسول عالی مرتبت ﷺ سے غداری کی
مرتکب ہورہی ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس صریح غداری کے باوجود ہم امید رکھتے ہیں کہ
بہرحال ہمیں اللہ کی مدد اور رسول ﷺ کا کرم حاصل رہے گا۔ حیرت ہے کہ وہ ملک جس کی
وزارت دفاع ۱۹۴۸ء میں یہ حکم صادر کرے کہ شریعت اسلامی کا ذکر نہ کیا جائے اور اسلامی ذہن
رکھنے والے افسروں پر نگاہ رکھی جائے۔ اسلام کے ناطے ہر حال میں اللہ کی مدد کی مدعی بھی رہے۔
اللہ اور رسول اکرم ﷺ سے بے وفائی کی وجہ سے ہماری آنکھوں میں اللہ کا نور ختم ہوگیا ہے۔ حق
ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے اور ہم جھوٹ اور مکر و فریب کے جال میں اس بری طرح سے
پھنس گئے ہیں کہ ہمیں کچھ بھی سوجھائی نہیں دیتا۔ قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی شاہ نعمت اللہ
ولی کی پیشین گوئی کے عین مطابق ہمارے دشمنوں کے کارندے ہمارے لیڈر بن بیٹھے، جنہوں
نے سچ بولنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا اور ہماری ہر فتح کو شکست میں تبدیل کردیا، جیسے کہ
۱۹۹۵ء میں سکھ سورماؤں کی فہرستیں راجیو گاندھی کو دے کر جہاد کشمیر کی پیٹھ میں ایک بار پھر خنجر
گھونپ دیا گیا تھا۔ ہماری ہر ممکن فتح کے موقعہ پر دلیر کمانڈروں کو ہٹا کر ان کی جگہ دشمن نواز کمانڈر
لگادیئے گئے اور ہماری ہر فتح، شکست یا ناکامی میں تبدیل ہو کے رہ گئی۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۸ء
میں جب جنرل اکبر خان کو طارق ہیڈکوارٹر بنانے کی اجازت ملی تو اس کی فوجی تزویروں اور
تدبیروں سے بھارتی فوج کے پرخچے اڑنے شروع ہوگئے اور جب وہ فتح یاب ہونے لگے تو
انہیں طارق ہیڈکوارٹر سے ہٹا دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم میں بہادری کے تمغے حاصل کرنے
والے اور جنگ کشمیر میں دلیری سے لڑنے والوں، جنرل اکبر خاں طارق، بریگیڈیر صدیق ستی

اور کرنل حسن مرزا کو تو راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر کے پولیس کے ڈرائنگ روموں سے گزارتے ہوئے جیل کی کال کوٹھڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ جبکہ غداریاں اور کوتاہیاں کرنے والوں کے لئے بہادری کے تمغے دیئے گئے۔ انگریز کمانڈروں نے اپنے پروردوں کے گرد قلعے تعمیر کر کے ان کو جنگ کشمیر کے ہیروز کے طور پر پیش کر دیا حالانکہ ان کے کارناموں پر کورٹ مارشل ہونا چاہیے تھا۔ اب تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اکبر خاں طارق اور ان کے ساتھیوں کو سازشی بنانا دراصل پاکستان کے خلاف ایک بڑی سازش تھی تا کہ آئندہ کوئی سچی بات نہ کرے۔

مجھے ذاتی طور پر جنرل مظفرالدین سابق مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و گورنر مشرقی پاکستان نے بتایا تھا کہ ان کے خیال میں لیفٹننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ دشمن کے ایجنٹ تھا۔ جو نقصان اس ملک کو موصوف نے پہنچایا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل یحییٰ کے مارشل لا کے دوران جنرل پیرزادہ کی حیثیت وزیراعظم پاکستان کی سی تھی۔

ہم ذوالفقار علی بھٹو کی ہندو ماں کا تو بہت ذکر کرتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ بیگم رعنا لیاقت علی بھی تو گڑھوال کے ایک پنڈت خاندان سے تھیں۔ ان کی ایک بہن مردان شوگر ملز کے مالک اشیر داس کی بیوی تھی۔ خود نواب افتخار حسین ممدوٹ نے فرمایا تھا کہ نوابزادہ لیاقت علی خان پاکستان کی جڑوں کو کبھی مضبوط نہ ہونے دیں گے۔ دراصل ہمارے ممدوح نوابزادہ لیاقت علی خان بھی ان کھوٹے سکوں میں سے تھے جنہیں ہمارے انگریز حکمران حضرت قائداعظم کی جیب میں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جہاد کشمیر کا بیڑہ غرق کرنے والا میجر خورشید انور بھی لیاقت علی خاں کا خاص الخاص آدمی تھا۔ کیا کوئی سچائی کمیشن ہمیں بتائے گا کہ وہ کیا وجوہات تھیں کہ زیارت ریزیڈنسی میں موصوف سے اپنی آخری ملاقات کے بعد حضرت قائداعظم پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے؟ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے حضرت قائداعظم کو ہر طرح سے اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ اپنی کابینہ میں قائداعظم کے وفادار وزراء راجہ غضنفر علی، اسماعیل چندریگر اور سردار عبدالرب نشتر کو یا تو سفارت پر باہر بھیج دیا یا کھڈے لائن لگا دیا۔ لیاقت علی خاں انگریزوں کے

[illegible] لیکن بیوروکریٹس اور فوجی افسران کے ساتھ مل کر پاکستان کے حاکم بن چکے تھے۔ جو کام بھی ان کے معتقد ساتھی سر ظفر اللہ خان کے سپرد کیا گیا، پاکستان کو اس میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دراصل یہی ہمارے قائد ملت اپنی ملت کو ایسی ذلت میں ڈبو گئے کہ آج تک ہم اس ذلت سے باہر نہیں نکل سکے۔ جس طرح ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں پولینڈ کی قرارداد پھاڑ کر مشرقی پاکستان بھارت کے حوالے کر دیا، اسی طرح نوابزادہ لیاقت علی خان نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مکہ دکھا کے کشمیر بھارت کے حوالے کر دیا۔

جہاد کشمیر کے جذبے میں سرشار قبائلی مجاہدین ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو بارہ مولا پہنچ گئے تھے اور وہ چند گھنٹوں میں سرینگر پہنچ سکتے تھے۔ اگر ان کو ایسے کرنے دیا جاتا تو پھر ان کو شہر سے نکالنا ناممکن ہو جاتا اور بھارتی فوج ۲۷ اکتوبر کی صبح کو بڈگام کے ہوائی اڈے پر اتر نہ سکتی۔ مگر مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے میجر خورشید انور نے سیاسی فیصلے کے انتظار میں مجاہدین کو بارہ مولا میں روکے رکھا کیونکہ اس کے ذمے سری نگر کو آزاد نہ کرانے کی ذمہ داری لگائی گئی تھی۔ دوسری طرف سازش کے تحت ۲۵ اکتوبر کو مہورا کا بجلی گھر بند کروا کے سرینگر میں اندھیرا گھپ کروا دیا گیا تاکہ مہاراجہ کشمیر خوفزدہ ہو کے بھارت کی گود میں جا گرے۔ ادھر سرحد کا ہمارا اپنا انگریز گورنر سر جارج کننگھم ۲۲ اکتوبر کو بھارتی فوج کے انگریز کمانڈر انچیف سر راب لاکھارٹ کو خبر دے چکا تھا کہ قبائلی مجاہدین کشمیر پر حملہ کے لئے دریائے اٹک پار کر چکے ہیں۔ ایک ضمنی سازش کے تحت سیالکوٹ کے قادیانی ڈپٹی کمشنر ایم۔ ایم۔ احمد نے جموں کا محاذ کھلنے نہ دیا اور بقول جنرل اکبر خاں طارق ہم نے جموں کو چھوڑ دیا لیکن جموں نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔

ایک نہایت ہی خطرناک سازش کے سرغنہ ذوالفقار علی بھٹو، سیکرٹری خارجہ عزیز احمد اور میجر جنرل اختر ملک تھے جنہوں نے ایک بڑی سوچی سمجھی پلان بنائی تھی، جس کے تحت لاہور کو بھارتی فوج کے حوالہ کر دیا جانا تھا۔ اس سازش کے تحت صدر ایوب خان سے چھمب جوڑیاں کے علاقہ میں گوریلا اس ضمانت پر داخل کرائے گئے کہ بھارت کسی حالت میں بھی پاکستان پر حملہ آور نہ ہوگا۔ شروع ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنرل موسیٰ سے آدھی فوج کو چھٹی پر رخصت کروا دیا گیا۔ متعلقہ فوجی

یونٹوں کو یہ حکم دیا گیا کہ لاہور کی سرحد پر چھ ستمبر کی صبح سے پہلے نہ پہنچیں اور بی آر بی ہرگز عبور نہ کریں۔ ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی شب کو لاہور میں سب بڑے افسران کو ایک بڑی دعوت میں مدعو کر کے نشہ میں دھت کر دیا گیا چنانچہ محافظ لاہور جنرل سرفراز ملک اور بریگیڈیئر قیوم شیر صبح ۸ بجے سو کے اٹھے جب تک واہگہ محاذ پر دشمن کے دو بڑے حملے پسپا ہو چکے تھے اس پر ستم ظریفی یہ تھی بریگیڈیئر قیوم شیر کی کئی یونٹیں ۶ ستمبر کی صبح پی ٹی میں موجود تھیں۔

مشیت الٰہی سے پاک فوج کی کچھ یونٹیں ۵ ستمبر کی شام کو بی آر بی پر مورچے سنبھال چکی تھیں اور یہ فوج کے وہ دستے تھے جنہوں نے ۶ ستمبر کی صبح کو دشمن کے لاہور کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا تھا بلکہ کچھ یونٹیں ۸، ۹ ستمبر کو بی آر بی عبور کر کے دشمن پر حملہ آور ہو گئیں۔ اس معرکہ بلاخیز میں ۱۶ پنجاب رجمنٹ کے گیارہ افسروں اور سو جوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ مزید سو زخمی ہوئے جب کہ ۲۲ کے جسد خاکی تک نہ مل سکے مگر ان کے غضبناک دفاع سے دشمن گھبرا کے رک گیا کیونکہ اسے تو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ لاہور تک کوئی خاص مزاحمت نہ ہوگی۔ بھارت کے جنرل چوہدری کی لاہور جیم خانہ میں جام نوش کرنے والی بات ایسے ہی ہوائی بڑ نہ تھی۔ بہر حال چند پلٹنوں کی بے مثال دلیری سے لاہور تو بچ گیا لیکن جن ہاتھوں نے یہ سازش کی تھی وہ اتنے مضبوط تھے کہ کسی کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی اور اسی سازش کے تحت جب بہادری کے تمغے بانٹنے کی باری آئی تو بی آر بی کے ادھر لڑنے والوں کے حصے میں بہت کم آیا۔ پھر جب لڑائی کا پانسہ پلٹا تو بھارتی سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے۔ بعد میں پتہ چلا کہ لاہور جیم خانہ پیگ نوش کرنے کی دعوت دینے والے بھارتی جنرل چوہدری نے دریائے بیاس تک پسپائی کے احکام دے دیئے تھے۔ مگر جب پاکستانی یونٹوں کو واہگہ سے واپس بلا لیا گیا اور کھیم کرن ناقص پلاننگ کی وجہ سے ہماری پیش قدمی رک گئی تو بھارتی واپس آ گئے اور اس طرح لاہور بارڈر پر ہم نے بھارتی لڑاکا مشین کو تباہ کرنے کا موقعہ کھو دیا۔ اس جنگ پر ایک فرانسیسی جنرل کا تبصرہ تھا کہ پاکستانی فوج کے کپتان تو بہت اچھے ہیں مگر جنرل کوئی اچھا نہیں۔ جنرل شیر علی اپنی ملازمت کے دوران کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر نہیں نبھا رہے اور وقت آئے گا کہ لوگ ہماری

قبریں کھود کر ہمیں قبروں سے باہر پھینک دیں گے۔ ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ اب وہ وقت سر پر آن کھڑا ہوا ہے۔

سچ بے شمار کتابوں، جریدوں اور اخبارات میں بکھرا پڑا ہے، جس کسی کو توفیق ہو اس کی بنیاد پر احتساب کا سلسلہ شروع کر سکتا ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ سچائی کمیشن تو ایک آزاد قوم قائم ہی کر سکتی ہے، جو غلامی کے سایوں سے آزاد ہو چکی ہو۔ غلامی کے سائے تو ایک طرف ہم تو ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ہم غلامی کی فرسودہ روایات کی پرستش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر فوجی پلٹنیں ابھی تک انگریزی فتوحات کے دن بڑے جوش و خروش سے مناتی ہیں، جو عموماً مسلمانوں کی شکست اور قتل عام پر مبنی ہیں۔ ابھی تک ہماری افواج کے جھنڈوں پر جو جنگی اعزازات نقش ہیں، ان کو پڑھ کر کسی بھی غیرت مند مسلمان کا سر شرم سے جھک جائے گا۔ ابھی تک ہماری پلٹنوں کے دفاتر میں انگریزی راج کے جھنڈے بڑے اہتمام سے سجائے جاتے ہیں۔ حضرت قائداعظم جب میرم شاہ میں فرسٹ پنجاب رجمنٹ کے معائنہ پر تشریف لے گئے تو ان کی نظر ٹیپو سلطان شہید کے ان نوادرات پر پڑی جو سرنگا پٹم میں اس پلٹن کے ہاتھ لگے تھے۔ جب حضرت قائداعظم کے استفسار پر بٹالین کمانڈر نے بتایا کہ یہ پلٹن کی تاریخ ہے، تو حضرت قائداعظم نے فرمایا کہ میں اس تاریخ سے شرمندہ ہوں۔ ذرا سوچیے کہ اس بری طرح محکوم تو ہم کبھی بھی نہ تھے کہ جتنا جنوبی افریقہ تھا۔ مگر پھر ہم میں کیا کمی ہے کہ ہم آزادی کے پچاس سال بعد بھی آزاد نہ ہو سکے جب کہ جنوبی افریقہ آزادی ملتے ہی آزاد ہو گیا۔ وہاں سچائی کمیشن نے کن کن سچائیوں کو عیاں نہیں کیا اور ایک ہم ہیں کہ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کو شائع کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اور تو اور وہاں اے۔ این۔ سی کے گوریلا ونگ کے سربراہ کو جنوبی افریقہ کی سفید فام بری فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہمارے لئے تو ایسا سوچنا بھی ممکن نہیں۔ المیہ یہ نہیں کہ ہم پچاس سالوں میں اپنے ملک میں اسلام رائج نہ کر سکے۔ المیہ تو یہ ہے کہ ہم پچاس سالوں میں آزاد بھی نہ ہو سکے۔

آثار قدیمہ میں طوفان نوحؑ کے ثبوت

ہارون یحییٰ

آثار قدیمہ میں طوفان کی شہادت

یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ آج ہمیں ان تباہ شدہ تہذیبوں کی باقیات مل رہی ہیں جن کے بارے میں قرآن پاک نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ آثار قدیمہ کی شہادت سے اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی تہذیب بڑی تیزی سے ختم ہوئی ہے تو ہمیں اس کی کچھ نہ کچھ باقیات بھی ضرورت ملیں گی۔

کسی تہذیب کے اچانک مٹ جانے میں، جو کسی قدرتی آفت، تیز رفتار نقل مکانی یا جنگ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے، اس تہذیب کے آثار عموماً خاصی بہتر حالت میں محفوظ ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کے رہائشی مکانات اور ان کے استعمال میں رہنے والے اوزار وغیرہ بہت کم وقت میں مٹی تلے دب جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک لمبے عرصہ تک انسانی دست برد سے محفوظ رہتے ہیں اور یوں جب انہیں کھود کا نکالا جاتا ہے تو وہ اپنی تہذیب کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

اسی طرح طوفان نوحؑ کے بارے میں بہت اہم شہادتیں آج ہمیں حاصل ہو چکی ہیں۔ یہ طوفان جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تین ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں رونما ہوا ہوگا، ایک پوری تہذیب کو چند لمحوں میں ختم کر گیا اور بعد ازاں اس کی جگہ ایک نئی تہذیب کے پروان چڑھنے کا سبب بنا۔ گویا اس طوفان کی ظاہری شہادت ہزاروں برس سے محفوظ رہی ہوگی تاکہ جب ہم اسے کھود کر نکالیں تو عبرت حاصل کر سکیں۔

میسوپوٹیمیا کے میدانوں کو غرق کر دینے والے اس طوفان کی کھوج میں اب تک کئی مقامات پر کھدائیاں کی جا چکی ہیں۔ اس علاقے کے چار مختلف اور قدیم مرکزی شہروں میں کی گئی کھدائیوں سے یہی آثار ملے ہیں کہ یہاں واقعی ایک ایسا سیلاب آچکا ہے جس نے پورے علاقے کو غرقاب کو دیا تھا۔ میسوپوٹیمیا کے یہ چار اہم شہر اُر، ایرخ، کش اور شروپک ہیں۔

ان چاروں شہروں میں کھدائی سے پتا چلا ہے کہ تقریباً 3000 قبل مسیح کے لگ بھگ، ایک ہی زمانے میں ان چاروں شہروں میں نہایت شدید سیلاب آیا تھا۔ پہلے ہم اُر کے شہر میں ہونے والی کھدائی کا جائزہ لیتے ہیں۔

''اُر'' میں ہونے والی کھدائی سے انسانی تہذیب کی قدیم ترین باقیات کا انکشاف ہوا ہے۔

آج اُر کا یہ شہر اپنے نئے نام ''طل المقیر'' سے پہچانا جاتا ہے مگر اس کی تہذیب 7000 قبل مسیح جتنی قدیم ہے۔ انسانی تہذیب کے اولین مقامات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اُر کا شہر (زمانہ قدیم میں) ان آبادیوں سے بھرپور رہا ہے جن میں سے ہر ایک نے آگے چل کر کئی اور تہذیبوں کو جنم دیا۔

اُر کے شہر سے ملنے والے آثار قدیمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر ایک زبردست سیلاب کے بعد تہذیب کا سلسلہ معطل ہو گیا تھا، جبکہ دوسری نئی تہذیبیں بعد کے زمانے میں یہاں پروان چڑھیں۔ پہلے پہل برٹش میوزیم کے آر۔ ایچ ہال نے یہاں کھدائی کروائی۔ ہال کے بعد یہ کام سر لیونارڈ وولی نے سنبھال لیا اور کھدائی کی مہم کو برٹش میوزیم اور یونیورسٹی آف پنسلوانیا کے باہمی تعاون سے آگے بڑھایا۔ وولی نے آثار قدیمہ کی کھوج میں جو کھدائیاں اس علاقے میں کروائیں، اور جنہوں نے آثار قدیمہ کے شعبے کو بین الاقوامی طور پر متاثر کیا، وہ 1922ء سے لے کر 1934ء تک جاری رہیں۔

سر وولی نے بغداد اور خلیج فارس کے درمیان، ریگستان کے وسط میں کھدائیاں کروائیں۔ شہر اُر کو پہلے پہل آباد کرنے والے لوگ شمالی میسوپوٹیمیا سے آئے تھے اور وہ خود کو ''عبیدیئن'' کہلواتے تھے۔ کھدائیوں سے ان لوگوں کے بارے میں معلومات جمع ہونے لگیں۔ وہاں کی ان کھدائیوں کے بارے میں جرمن ماہر آثار قدیمہ ورنر کیلر نے لکھا ہے:

''.... اُر کے باشاہوں کی قبریں''.... یہ الفاظ وولی نے خوشی اور وفور جذبات کے عالم میں، سمیری اشرافیہ کے مقبروں کے لئے اس وقت بے اختیار استعمال کئے جب ماہرین آثار قدیمہ کے بیلچوں اور پھاڑوں نے بڑے مقبرے کے جنوب میں پچاس فٹ اونچے ایک ٹیلے پر حملہ کیا اور وہاں دبی ہوئی، ایک کے اوپر ایک قبروں کی ایک لمبی قطار دریافت کی۔ پتھر کے طاقچے صحیح معنوں میں گویا خزانے کے صندوق تھے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک شراب کے قیمتی پیالوں، خوبصورتی سے بنائے گئے جگوں اور گلدانوں، پیتل سے ڈھالے گئے میز کے برتنوں، سچے موتیوں کے جڑاؤ کام، سنگ لاجورد اور چاندی سے بھرے ہوئے تھے، اور جنہوں نے مٹی میں ڈھلے ہوئے جسموں کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ دیوار کے ساتھ بربط اور سرود (آلات موسیقی) رکھے تھے۔ ''تقریباً اچانک ہی'' وہ بعد ازاں اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔ ''وہ دریافتیں کی جا چکی تھیں جو ہمارے شبہات کی تصدیق کرتی تھیں۔ شاہی مقبروں میں سے ایک کے فرش کے عین نیچے ہمیں مٹی کی ایک اور تہہ ملی، جس میں جلی ہوئی لکڑی کی راکھ کے ساتھ ساتھ چکنی مٹی کی متعدد

تختیاں بھی موجود تھیں۔ مٹی کی ان تختیوں پر لکھی تحریر کے حروف، قبروں والی تحریر کے الفاظ سے کہیں زیادہ قدیم طرز کے تھے۔ اس طرز تحریر کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ لگایا گیا کہ یہ سفالی تختیاں تقریباً 3000 قبل مسیح جتنی قدیم ہیں۔ لٰہذا وہ مقبروں کی بہ نسبت دو یا تین صدیاں پہلے کی تھیں۔'' سرنگیں گہری ہوتی جارہی تھیں، مٹی کی نئی تہیں جن میں مرتبانوں، برتنوں، اور پیالوں وغیرہ کے ٹکڑے نمایاں تھے، یکے بعد دیگرے سامنے آتے جارہی تھیں۔ ماہرین نے واضح طور پر محسوس کیا کہ برتنوں کی ساخت اوران پر نقش ونگار وغیرہ میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کے سب (برتن وغیرہ) بھی بادشاہوں کی قبروں سے نکلے ہوں۔ لٰہذا یہ ثابت ہوا کہ سمیری تہذیب، کئی صدیوں تک کسی بڑی یا بنیادی تبدیلی سے ہم کنار نہیں ہوئی۔ اس (اخذ کردہ) نتیجے کے مطابق، وہ لازماً ترقی کی بلندی پر خاصی ابتداء ہی میں پہنچ گئے ہونگے۔

جب کئی دن بعد وولی کے کارکنوں نے اسے بتایا ''ہم سب سے نچلی سطح پر پہنچ چکے ہیں'' تو وہ اپنی تسلی کے لئے خود ہی سرنگ میں اتر گیا اور فرش (سب سے نچلے مقام) تک پہنچ گیا۔ وولی کا پہلا خیال تھا ''بس! یہی اختتام ہے''۔ یہ ریت تھی، خالص ریت، ایسی ریت جو صرف پانی کے ساتھ آ کر ہی وہاں جمع ہوسکتی تھی۔

انہوں نے سرنگ کو مزید گہرا کرنے کے لئے کھدائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے پھاوڑے زمین میں گہرے سے گہرے اترتے گئے: تین فٹ، چھ فٹ... اب تک صرف خالص ریت ہے۔ اچانک دس فٹ پر ریت کی یہ تہہ اسی طرح یکا یک ختم ہوگئی جیسے شروع ہوئی تھی۔ گارے کی تقریباً دس فٹ موٹی اس تہہ کے نیچے، انہیں انسانی آبادی کی ایک تازہ شہادت نظر آئی۔ برتنوں کی ظاہری شکل اور معیار میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ یہ سب دست کاری کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ دھات کی کوئی چیز نہیں مل سکی۔ ابتدائی نوعیت کے اوزار جو یہاں سے برآمد ہوئے، وہ تراشے وہ چقماق پتھر سے تیار کئے گئے تھے۔ یقیناً وہ پتھر کے زمانے سے تھے!

ریت اور گارے کی اتنی موٹی تہہ کے یوں جمع ہو جانے کی واحد وجہ اُر کے علاقے میں کوئی زبردست سیلاب یا طوفان ہوسکتا تھا، جس نے بہت واضح انداز میں انسانی آبادی کی دو مختلف جہتوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا تھا۔ سمندر نے اپنے ناقابل تردید ثبوت چھوڑے تھے جو ریت اور گارے کی تہہ میں دبے، سمندری جانداروں کی باقیات کی شکل میں تھے۔

خردبینی تجزیے سے پتا چلا ہے کہ اُر کے مقام پر پہاڑی کے نیچے جمع ہو جانے والی ریت اور گارے کی یہ وسیع تہہ ایک ایسے زبردست سیلاب کا نتیجہ تھی جس نے قدیم ترین سمیری تہذیب کو

ان کی آن میں غرقاب کر دیا ہوگا۔ گلگا میش کی زرمیہ داستان اور قصہ نوحؑ دونوں اس سرنگ کے سب سے گہرے حصے میں، میسوپوٹیمیا کے ریگستان کے نیچے یکجا ہو رہی تھیں۔

میکس میلووان نے لیونارڈ وولی کے خیالات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ وقت کے اتنے مختصر دورانئے میں ایلوویئم (سمندری مٹی) کی اتنی بڑی تہہ بن جانے کا عمل کسی زبردست طوفان کا نتیجہ ہی ہوسکتا ہے۔ وولی کا کہنا بھی یہی تھا کہ شہر العبید کو جس کے باسی منقش، برتن استعمال کرتے تھے۔ سمیری شہر ''اُر'' سے جدا کرنے والی تہہ کسی بڑے سیلاب کی باقیات میں سے ہے۔

ان تمام شواہد سے یہی پتا چلتا ہے کہ اُر کس شہر، سیلاب سے متاثر ہونے والے مقامات میں سے ایک تھا۔ مذکورہ بالا کھدائی کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ورنر کیلر نے بھی یہی کہا ہے کہ میسو پوٹیمیا کی کھدائیوں میں گارے اور مٹی کی تہہ کے نیچے سے کسی تباہ شدہ شہر کے آثار قدیمہ ملنا اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہاں کوئی سیلاب لازماً آیا تھا۔

میسوپوٹیمیا کا ایک اور شہر، جہاں سے سیلاب کے شواہد دستیاب ہوئے ہیں ''سمیریوں کا شہر شَن'' ہے جسے آج ''طل ال اوحمیر'' کہا جاتا ہے۔ قدیم سمیری ذرائع کے مطابق یہ شہر ''طوفان نوحؑ کے بعد اولین سلطنت کا دارالخلافہ'' بھی تھا۔

جنوبی میسوپوٹیمیا میں ''شورپک'' کا شہر جس کا جدید نام ''طل فعراح'' ہے۔ اسی طرح کے کسی سیلاب کے ظاہری آثار لئے ہوئے ہے۔ یونیورسٹی آف پنسلوانیا کے ایرک شمٹ نے 1920ء سے 1930ء تک اس شہر میں آثار قدیمہ کا مطالعہ کیا۔ ان کھدائیوں میں انسانی بستیوں کی باقیات پر مشتمل تین تہیں دریافت ہوئیں جو زمانہ قبل از تاریخ کے آخری ایام سے لے کر ''اُر'' کی تیسری بادشاہت تک (2112 تا 2004 قبل مسیح) کا احاطہ کرتی ہیں۔ سب سے نمایاں دریافتوں میں ان تباہ شدہ مکانوں کی باقیات بھی شامل ہیں جنہیں بہت اچھی طرح تعمیر کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں پکی مٹی کی تختیاں، جن پر الفاظ کی فہرستیں اور انتظامی ریکارڈ وغیرہ کندہ کئے گئے ہیں۔ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس جگہ لگ بھگ 3000 قبل مسیح سے بھی پہلے کوئی نہایت ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی۔

مرکزی نکتہ یہ ہے کہ 2900 سے 3000 قبل مسیح کے درمیان اس شہر میں کسی بڑے طوفان یا سیلابی آفت رونما ہونے کی علامات نمایاں ہیں۔ سیلووان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، سطح زمین سے چار تا پانچ میٹر نیچے، شمٹ کو مٹی کی پیلی تہہ ملی (جو سیلاب کے باعث بنی تھی) جو چکنی مٹی اور ریت کے آمیزے پر مشتمل تھی۔ یہ تہہ قبرستانی ٹیلے **Tumulus** کی بہ نسبت

سیدھی سطح سے زیادہ قریب تھی اور اس کا مشاہدہ قبرستانی ٹیلے کے چاروں طرف کیا جا سکتا تھا۔ شمٹ نے اس تہہ کو چکنی مٹی اور ریت کا آمیزہ بتایا ہے۔ شمٹ مصری قدیم سلطنت کے زمانے سے "دریا سے وجود میں آنے والی مٹی" کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے اور اس کا تعلق طوفان نوح سے جوڑا جاتا ہے۔

شروپک شہر میں بھی کھدائی کے بعد سیلاب کی جو باقیات ملی ہیں، وہ بھی تقریباً 2900 سے 3000 قبل مسیح تک کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ غالباً شروپک شہر بھی اس طوفان سے اتنا ہی متاثر ہوا تھا جتنے کہ دوسرے شہر ہوئے تھے۔

سب سے آخری اور تازہ ترین مقام جس کے ایک زبردست طوفان سے متاثر ہونے کے شواہد ملے ہیں، اریخ کا شہر ہے جو شروپک کے جنوب میں واقع ہے اور آج "تل الورقا" کہلاتا ہے۔ باقی تین شہروں کی طرح یہاں سے بھی سیلاب کے باعث بننے والی (مٹی کی) تہہ دریافت ہوئی ہے۔ اندازہ ہے کہ دوسرے شہروں کی طرح یہ تہہ بھی 2900 تا 3000 قبل مسیح جتنی قدیم ہے۔

جیسا کہ ہمیں بخوبی علم ہے، دریائے دجلہ اور دریائے فرات، میسوپوٹیمیا کو ایک سے دوسرے سرے تک گویا کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس واقعے (طوفان نوح) کے دوران نہ صرف یہ دونوں دریا، بلکہ پانی کے دیگر تمام چھوٹے بڑے ذرائع بھی لبریز ہو کر ابل پڑے تھے جنہوں نے خوفناک بارش کے برستے ہوئے پانی کے ساتھ مل کر ہلاکت خیز طوفان کو جنم دیا تھا۔ قرآن پاک میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ترجمہ: "پس ہم نے آسمان کے دروازوں کو زور کے مینہ سے کھول دیا۔ اور زمین سے چشموں کو جاری کر دیا۔ پس اس کام کے لئے جو مقدر کیا گیا تھا (دونوں) پانی جمع ہو گئے"۔ (سورۃ القمر۔ آیات 11 تا 12)

جب طوفان نوحؑ کے اسباب کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب قطعی طور پر فطری مظاہر ہی تھے۔ تاہم ان کا معجزاتی پہلو یہ ہے کہ اول تو وہ سب بیک وقت رونما ہوئے، اور دوم یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو اس آفت کے بارے میں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔

مکمل شدہ مطالعات سے حاصل ہونے والی شہادتوں کے تجزیئے سے معلوم ہوا ہے کہ طوفان نوحؑ کا علاقہ (چوڑائی میں) تقریباً 160 کلومیٹر شرقاً غرباً اور (لمبائی میں) تقریباً

800 کلومیٹر شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیلاب نے میسوپوٹیمیا کے سارے میدانی علاقے کو گھیر لیا تھا۔ جب ہم اُر، ارخ، شروپک اور کش کے شہروں کی ترتیب کا جائزہ لیتے ہیں، جہاں زبردست طوفان کے آثار ملے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ گویا ایک قطار کی شکل میں ہیں۔ لہٰذا طوفان نے ان چاروں شہروں کے علاوہ گردونواح کے علاقے کو بھی لازماً متاثر کیا ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ میسوپوٹیمیا کے میدانی علاقے کی جو جغرافیائی حالت 3000 قبل مسیح میں تھی، آج اس سے بہت مختلف ہے۔ اس زمانے میں دریائے فرات، آج کی بہ نسبت زیادہ مشرق میں تھا، اور اس کے بہاؤ کا راستہ وہی تھا جس کے آس پاس اُر، ارخ، شروپک اور کش کے شہر آباد تھے۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیات قرآنی میں طوفان نوحؑ کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے دریائے فرات میں زبردست طغیانی آئی تھی جس نے میسوپوٹیمیا کے ان چاروں شہروں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔

مذاہب اور تہذیبوں میں طوفان نوحؑ کا تذکرہ

یہ واضح ہے کہ جب دنیا کی مختلف تہذیبوں اور اقوام میں اللہ تعالیٰ کی پیغمبر آئے ہونگے تو انہوں نے سچائی کی دعوت دیتے ہوئے، اللہ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے اپنے لوگوں کو طوفان نوحؑ کا قصہ بھی سنایا ہوگا۔ تاہم ان میں سے بیشتر تہذیبوں میں، بعد کی نسلوں نے ان واقعات کو مسخ کر دیا اور ان کی حقیقت فراموش کر کے دیومالائی کہانیوں میں تبدیل کر دیا۔

انبیائے کرام کے علاوہ، اللہ تعالیٰ نے طوفانِ نوحؑ کا تذکرہ پیغمبران کرام پر نازل کیے گئے صحائف اور الہامی کتب میں بھی فرمایا ہے تاکہ وہ اقوام نصیحت پکڑیں۔ مگر، سینہ بہ سینہ کہانیوں کی طرح ان صحائف اور الہامی کتب کے متن میں بھی تحریف کر دی گئی اور طوفان نوحؑ کے اصل قصے میں دیومالائی عناصر شامل کر دیئے گئے۔ اس وقت صرف قرآن پاک ہی وہ واحد الہامی کتاب ہے جو اپنی اصل حالت میں، من وعن موجود ہے۔ اس مقدس ترین الہامی کتاب میں طوفان نوحؑ کے حوالے سے جو واقعات آئے ہیں، ان کی تصدیق جدید سائنسی مشاہدات سے بھی ہو چکی ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ قرآن پاک کی حفاظت اور اسے کسی بھی قسم کی تحریف سے بچانے کا ذمہ کسی اور نے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں فرمادیا ہے:

ترجمہ: ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ (سورۃ الحجر۔ آیت 9) یعنی قرآن پاک خاص اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہے۔

طوفان نوحؑ کی تفصیلات اور دوسری جزئیات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قدیم اور جدید عہد ناموں سمیت، دیگر مذہبی وتہذیبی دستاویزات میں اس قصے کی نوعیت و تفصیل کیسے بیان کی گئی ہے۔

عہد نامہ قدیم میں طوفان نوحؑ

حضرت موسیٰؑ پر ''تورات'' کے نام سے یہ کتاب نازل کی گئی تھی۔ یہ الہامی کتاب تو تمام کی تمام ہی ضائع ہو چکی ہے جس کی کوئی ایک اصل عبارت بھی آج دستیاب نہیں۔ ''پنتا تیوخ'' بھی ایک مدت سے اصل توریت کے ساتھ اپنا ہر طرح کا تعلق گم کر چکے ہیں (حالانکہ انہیں توریت کے پانچ اولین نسخے بھی قرار دیا جاتا ہے)۔ اس پر بھی خود پنتا تیوخ کے کئی حصوں میں یہودی ربائیوں (مذہبی پیشواؤں) نے متعدد مشکوک تبدیلیاں کر کے اس بے اعتباری کو دو چند کر دیا ہے۔ بنی اسرائیل کے پاس آنے والے دیگر پیغمبروں کے صحائف میں بھی اسی طرح ان گنت تبدیلیاں کی گئیں اور ان کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔ لہٰذا ان تمام باتوں کی روشنی میں، عہد نامہ قدیم کو تحریف شدہ توریت کہنے کے بجائے ''تحریف شدہ پنتا تیوخ'' کہنا زیادہ درست ہوگا کیونکہ اس کا اصل وحی / صحیفے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عہد نامہ قدیم کو تاریخ کی ایک ایسی کتاب سمجھنا چاہیے جسے انسانوں نے اپنے قبائل کا ریکارڈ رکھنے کی غرض سے مرتب کیا تھا، نہ کہ کوئی الہامی کتاب۔ قرآن پاک میں قوم نوحؑ اور طوفان نوحؑ کے حالات سے تھوڑی بہت مماثلت کے باوجود اس بات پر کوئی حیرت نہیں کرنی چاہیے کہ تبدیل شدہ پنتا تیوخ میں حالات کی نوعیت اور تفصیلات کی بابت جا بجا (قرآنی واقعات سے) اختلافات موجود ہیں۔

عہد نامہ قدیم کے مطابق، خداوند نے نوح کو حکم سنایا کہ ایمان لانے والوں کے سوا ہر ایک کو تباہ کر دیا جائے گا کیونکہ زمین ظلم وتشدد سے بھر گئی ہے۔ خداوند نے نوح کو حکم دیا کہ وہ ایک کشتی بنائے اور اسے تفصیل سے بتایا کہ کشتی کیسے بنائی جائے۔ اس نے نوح سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے گھر والوں کو ساتھ سوار کر لے: اپنے تین بیٹوں کو ان کی بیویوں کو، ہر جاندار شے کی دو دو چیزیں اور کچھ دوسرا سامان۔ سات دن بعد، جب طوفان کا وقت آ گیا، زیر زمین پانی کے تمام ذخیرے پھٹ پڑے، آسمانوں کی کھڑکی کھل گئی اور زبردست سیلاب ہر چیز پر چھا گیا۔ یہ کیفیت چالیس دن اور چالیس راتوں تک رہی۔ (نوحؑ کی) کشتی پانی پر چلتی رہی جو سارے پہاڑوں اور بلند پہاڑیوں سے بھی بلند تر تھا۔ پس! صرف وہی بچ گئے جو نوح کے ساتھ کشتی پر سوار تھے اور باقی

تمام کو طوفان کا پانی بہا کر لے گیا اور وہ ڈبو کر ہلاک کر دیے گئے۔ سیلاب کے بعد بارش تھم گئی، جو چالیس دن اور چالیس رات تک جاری رہی تھی، اور اس کے 150 دن بعد پانی نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔

اس کے بعد، ساتویں مہینے کے 17ویں دن، کشتی اراراط (اگری) کے پہاڑوں میں جا کر ٹھہری۔ نوح نے ایک کبوتر اڑایا تاکہ یہ معلوم کرے کہ پانی مکمل طور پر پیچھے ہٹ چکا ہے یا نہیں، اور آخر کار جب کبوتر واپس نہ آیا تو اس نے سمجھ لیا کہ پانی پوری طرح سے ہٹ گیا ہے۔ خداوند نے انہیں کشتی سے اترنے اور زمین پر پھیل جانے کا حکم دیا۔

عہد نامہ قدیم کی اس کہانی میں ایک جھول یہ ہے کہ اس خلاصے کے بعد (اسی کتاب کے) یہودی متن (Yahwist text) میں یہ کہا گیا ہے کہ خداوند نے نوح کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ ان سات جانوروں کے جوڑے، نر اور مادہ رکھ لے جنہیں خداوند نے "پاک" قرار دیا ہے اور ان جانوروں کو بھی جنہیں اس نے "ناپاک" کہا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ عبارت مذکورہ بالا متن سے واضح اختلاف کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں قدیم عہد نامے میں طوفان نوحؑ کا دورانیہ بھی مختلف ہے۔ یہودی متن کے مطابق، پانی چالیس دن تک چڑھتا رہا، جبکہ ایک عام آدمی کو یہ مدت 150 دن بتائی جاتی ہے۔

طوفان نوحؑ کے بارے میں عہد نامہ قدیم کے کچھ حصے ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں:

"اور خدا نے نوح سے کہا کہ تمام بشر کا خاتمہ میرے سامنے آ پہنچا ہے، کیونکہ ان کے سبب سے زمین ظلم سے بھر گئی ہے۔ سو دیکھ میں زمین سمیت ان کو ہلاک کروں گا۔ تو گوپھر کی لکڑی کی ایک کشتی اپنے لئے بنا۔ اس کشتی میں کوٹھریاں تیار کرنا اور اس کے اندر اور باہر رال لگانا۔ اور ایسا کرنا کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ، اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ ہو۔ اور اس کشتی میں ایک روشندان بنانا اور اوپر سے ہاتھ بھر چھوڑ کر اسے ختم کر دینا اور اس کشتی کا دروازہ اس کے پہلو میں رکھنا اور اس میں تین درجے بنانا: نچلا، دوسرا اور تیسرا۔ اور دیکھ میں خود زمین پر پانی کا طوفان لانے والا ہوں تاکہ ہر بشر کو جس میں زندگی کا دم ہے، دنیا سے ہلاک کر ڈالوں اور سب جو زمین پر ہیں مر جائیں گے۔ پر تیرے ساتھ میں اپنا عہد قائم کرونگا اور تو کشتی میں جانا۔ تو اور تیرے ساتھ تیرے بیٹے اور تیری بیوی اور تیرے بیٹوں کی بیویاں۔ اور جانوروں کی ہر قسم میں دو دو اپنے ساتھ کشتی میں لے لینا کہ وہ تیرے ساتھ جیتے بچیں۔ وہ نر و مادہ ہوں۔ اور پرندوں کی ہر قسم میں سے اور چرندوں کی ہر قسم میں سے اور زمین پر رینگنے والوں کی ہر قسم میں سے دو دو تیرے

پاس آئیں تاکہ وہ جیتے بچیں۔ اور تو ہر طرح کے کھانے کی چیز لے کر اپنے پاس جمع کر لینا کیونکہ یہی تیرے اور ان کے کھانے کو ہوگا۔ اور نوحؑ نے یونہی کیا۔ جیسا خدا نے اسے حکم دیا تھا ویسا ہی عمل کیا"۔ (پیدائش۔ باب 6:13 تا 22)

"کل پاک جانوروں میں سے سات سات نر اور ان کی مادہ اور ان میں سے جو پاک نہیں ہیں دو دو نر اور ان کی مادہ اپنے ساتھ لے لینا۔ اور ہوا کے پرندوں میں سے بھی سات سات نر اور مادہ لینا تاکہ زمین پر انکی نسل باقی رہے"۔ (پیدائش۔ باب 7:2 تا 3)

"میں اس عہد کو تمہارے ساتھ قائم رکھوں گا کہ سب جاندار طوفان کے پانی سے پھر ہلاک نہ ہونگے اور نہ کبھی زمین کو تباہ کرنے کے لئے پھر طوفان آئے گا"۔ (پیدائش۔ باب 9:11)

عہد نامہ قدیم کے مطابق، اس حکم سے کہ "اور سب جو زمین پر ہیں مر جائیں گے" ایسے کسی طوفان کا تصور سامنے آتا ہے جس نے ساری دنیا کو غرقاب کر دیا ہو، سارے کے سارے لوگوں کو سزا دی گئی ہو اور صرف وہی زندہ بچے ہوں جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔

جدید عہد نامہ میں طوفان نوحؑ

آج جو نیا عہد نامہ عہد نامہ جدید ہمیں دستیاب ہے، وہ بھی صحیح معنوں میں الہامی کتاب نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے اعمال و اقوال پر مستمل یہ نیا عہد نامہ ان چار اناجیل (Gospels) سے شروع ہوتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سو سال بعد، ایسی لوگوں نے مرتب کیں جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو کبھی حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ بھی نہیں رہے تھے۔ ان چاروں اناجیل کے مرتبین نام بہ نام متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کہلاتے ہیں۔ آپس میں یہ چاروں اناجیل بھی ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہیں اور ان کے بیانات میں تضادات نمایاں ہیں۔ خاص طور پر یوحنا کی انجیل، باقی کی تینوں اناجیل سے (جنہیں مشترکہ طور پر "ہم نظر اناجیل" بھی کہا جاتا ہے) بہت زیادہ مختلف ہے جن کے بیانات میں کسی حد تک (لیکن مکمل طور پر نہیں) مماثلت پائی جاتی ہے۔ نئے عہد نامہ میں شامل باقی کتابیں حواریوں اور ترسوس کے ساؤل (جسے بعد ازاں "سینٹ پال" کا نام دیا گیا) کے مابین خط و کتابت پر مشتمل ہیں۔ جس میں حضرت عیسیٰؑ کے بعد حواریوں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ لہٰذا آج کا جدید عہد نامہ کوئی الہامی کتاب یا صحیفہ نہیں، بلکہ اصل میں ایک نیم تاریخی کتاب ہے۔

عہد نامہ جدید میں طوفان نوحؑ کو مختصراً کچھ یوں بیان کیا گیا ہے: حضرت نوحؑ کو ایک نافرمان قوم پر پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اور وہ لوگ گمراہی میں مبتلا تھے۔ مگر قوم نوح نے اپنے پیغمبر

(نوحؑ) کی تابعداری نہیں کی اور اپنی بداعمالیاں جاری رکھیں۔ اس پر خداوند نے ایک طوفان بلا بھیجا تاکہ انکار کرنے والوں کا احتساب کرے۔ اور خداوند نے نوحؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کو ایک کشتی میں سوار کرا کے بچالیا۔ عہد نامہ جدید کے بعض ابواب جن میں اس واقعے کی تفصیل بیان کی گئی ہے، درج ذیل ہیں:

''جیسا نوحؑ کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا۔ کیونکہ جس طرح طوفان سے پہلے کے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور شادی بیاہ کرتے تھے، اس دن تک کہ نوحؑ کشتی میں داخل ہوا۔ اور جب تک طوفان آ کر ان سب کو بہانہ لے گیا ان کو خبر نہ ہوئی، اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا''۔ (متی۔ باب 24: 37 تا 39)

''اور نہ پہلی دنیا کو چھوڑا بلکہ بے دین دنیا پر طوفان بھیج کر راست بازی کی منادی کرنے والے نوح کو مع اور سات آدمیوں کے بچالیا''۔ (پطرس کا دوسرا عام خط۔ باب 2: 5)

''اور جیسا نوح کے دنوں میں ہوا تھا اسی طرح ابن آدم کے دنوں میں ہوگا۔ کہ لوگ کھاتے پیتے تھے اور ان میں بیاہ شادی ہوتی تھی۔ اس دن تک جب نوح کشتی میں داخل ہوا اور طوفان نے آ کر سب کو ہلاک کیا''۔ (لوقا۔ باب 27: 26 تا 27)

''جو اس اگلے زمانے میں نافرمان تھیں جب خدا نوح کے وقت میں تحمل کر کے ٹھہر رہا تھا اور وہ کشتی تیار ہو رہی تھی جس پر سوار ہو کر تھوڑے سے آدمی یعنی آٹھ جانیں پانی کے وسیلہ سے بچیں۔ (پطرس کا پہلا عام خط۔ باب 3: 20)

''وہ تو جان بوجھ کر یہ بھول گئے تھے کہ خدا کے کلام کے ذریعہ سے آسمان قدیم سے موجود ہیں اور زمین پانی میں سے بنی اور پانی میں قائم ہے۔ ان ہی کے ذریعے سے اس زمانہ کی دنیا ڈوب کر ہلاک ہوئی''۔ (پطرس کا دوسرا عام خط۔ باب 3: 5 تا 6)

دوسری تہذیبوں میں ''بڑے طوفان'' کا تذکرہ

سمیری تہذیب میں: ایک دیوتا انلیل نے لوگوں سے کہا کہ دوسرے دیوتا انسانیت کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں، مگر وہ انہیں بچانا چاہتا ہے۔ اس کہانی کا ہیرو، سپور شہر کا مخلص بادشاہ زیوسودرا ہے۔ انلیل دیوتا نے زیوسودرا کو بتایا کہ بڑے طوفان سے بچنے کے لئے (اسے) کیا کرنا چاہیے۔ کشتی کی تیاری بیان کرنے والا حصہ دستیاب نہیں، تاہم یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ حصہ موجود تھا جو کئی ٹکڑوں کی شکل میں تھا اور جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ زیوسودرا نے کس طرح کشتی بنائی اور اسے کیسے بچایا گیا۔ طوفان کے حوالے سے بابل کی کہانیوں پر انحصار کرتے ہوئے

یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سمیری دیو مالا (کے گمشدہ حصے) میں یہ کہانی زیادہ طویل رہی ہوگی جس میں طوفان برپا ہونے کے اسباب اور کشتی کی تیاری وغیرہ جیسے امور کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہوگا۔

بابل کی تہذیب میں: سمیری دیو مالا میں زیوسودرا کا کردار بابل میں آ کر "اُت پنشتم" نام اختیار کر گیا ہے۔ ایک اور اہم کردار گلگامیش بھی نمایاں ہے۔ داستان کے مطابق گلگامیش یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کو تلاش کرے گا اور ان سے ہمیشہ زندہ رہنے کا راز حاصل کرے گا۔ اسے اس سفر کی مشکلات اور خطرات سے خبردار کیا جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسے سفر پر نکلنا چاہتا ہے جس میں اسے "ماشو پہاڑوں اور موت کے پانیوں" سے گزرنا پڑے گا، اور اب تک یہ سفر صرف سورج دیوتا "شماش" (شمس) ہی مکمل کر سکا ہے۔ اس کے باوجود، گلگامیش بڑی بہادری سے اس سفر کی تکالیف اور خطرات جھیلتا ہوا، آخر کار اُت پنشتم تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

داستان کا متن اس مقام سے منقطع ہے جہاں گلگامیش اور اُت پنشتم کی ملاقات شروع ہونے کا تذکرہ ہے۔ تاہم جس جگہ سے متن قابل فہم ہوتا ہے، وہاں اُت پنشتم، گلگامیش سے کہہ رہا ہے کہ "دیوتاؤں نے موت اور زندگی کا راز صرف اپنے آپ تک محدود رکھا ہوا ہے" (یعنی وہ راز وہ انسانوں کو نہیں دیتے)۔ اس پر گلگامیش نے اُت پنشتم سے پوچھا کہ اسے ہمیشہ کی زندگی کیسے حاصل ہوئی، اور اس سوال کے جواب میں اس نے گلگامیش کو ایک سیلاب کی کہانی سنائی۔ طوفان عظیم کی یہ داستان گلگامیش رزمیہ کی مشہور زمانہ کہانی "بارہ میزیں" میں بھی بیان کی گئی ہے۔

اُت پنشتم نے یہ کہہ کر آغاز کیا کہ جو کہانی وہ گلگامیش کو سنانے جا رہا ہے وہ "ایک راز ہے، دیوتاؤں کا راز" اس نے بتایا کہ وہ شروپک کے شہر سے تھا، جو سرزمین عکاد کا قدیم ترین شہر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق دیوتا "ایا" نے گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی کی دیواروں سے آواز دے کر اسے بلایا اور اطلاع دی کہ دیوتاؤں نے زندگی کے تمام بیجوں کو سیلاب سے تباہ کر ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاہم اس فیصلے کی وجہ، بابل کی داستانوں میں کہیں موجود نہیں، بالکل اسی طرح جیسے سمیری تہذیب کی دیو مالا کا معاملہ ہے۔ اُت پنشتم نے کہا کہ ایا نے اسے ایک کشتی بنانے، اور اس میں "ساری زندہ اشیاء کے بیج" لا کر رکھنے کا حکم دیا۔ ایا نے اسے بتایا کہ کشتی کی جسامت اور ساخت کیسی ہونی چاہیے، اس کے مطابق کشتی کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی ایک دوسرے کے برابر تھیں۔ طوفان نے چھ دن اور چھ راتوں کے لئے ہر چیز کو الٹ کر رکھ دیا۔ ساتویں دن طوفان

ٹھہر گیا۔ اُت پنشتم نے دیکھا کہ باہر (سب کے سب) ''چپکنے والی کیچڑ میں تبدیل ہو چکا تھا''۔ کشتی کوہ نسیر پر جا کر ٹھہری۔
بابل اور سمیر کی دستاویزات کے مطابق ''ژیسوتھروز'' یا ''خاسیساترا'' کو 952 میٹر لمبی ایک کشتی میں اس کے گھر والوں، دوستوں، کچھ پرندوں اور چند جانوروں سمیت بچالیا گیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ''آسمانوں سے پانی برس رہا تھا، سمندروں نے ساحلوں کو ڈھانپ لیا تھا اور دریاؤں میں طغیانی آ گئی تھی''۔ اس کے بعد کشتی کورائیدایان پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔
بابل کے اشوری عہد کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ ''اوبرتوتو'' یا ''خاسیساترا'' کو اس کے گھر والوں، ملازموں، پالتو مویشیوں اور جنگلی جانوروں سمیت ایک ایسی کشتی میں بچالیا گیا جس کی لمبائی 600 کیوبٹ، جبکہ چوڑائی اور اونچائی 60 کیوبٹ جتنی تھی۔ طوفان 6 دن اور 6 راتوں تک جاری رہا۔ جب کشتی کوہ نزار پر پہنچی تو آزاد کیا ہوا ایک کبوتر واپس آ گیا مگر کوا واپس نہیں آیا۔
بعض سمیری، اشوری اور بابلی دستاویزات کے مطابق، اُت پنشتم اپنے گھر والوں کے ساتھ اس طوفان میں زندہ بچ گیا جو 6 دن اور 6 راتوں تک جاری رہا۔ یہ کہا جاتا ہے: ''ساتویں دن اُت پنشتم نے باہر جھانکا۔ وہاں ہر طرف بالکل خاموشی تھی۔ انسان ایک بار پھر مٹی اور گارے میں تبدیل کر دیئے گئے تھے''۔ جب نزار کے پہاڑ پر کشتی رکی تو اُت پنشتم نے ایک کبوتر، ایک کوا اور ایک چڑیا اڑائی۔ کوا لاشیں کھانے لگا، لیکن باقی دو پرندے (بھی) واپس نہیں آئے۔
ہندوستان: شتا پتھا براہمان (شت پتھ برہمن) اور مہا بھارتا (مہابھارت) کی رزمیہ داستانیں، جو ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ان کے مطابق ''مانو'' نام کے ایک شخص کو ''رشیوں'' کے ساتھ ایک زبردست طوفان سے بچالیا گیا تھا۔ اس داستان کے مطابق، مانو نے ایک مچھلی پکڑی جسے اس نے مار دیا، لیکن اچانک وہ مچھلی زندہ ہوگئی اور کہنے لگی کہ ایک کشتی بنا اور اسے میرے سینگوں سے باندھ دے۔ اس مچھلی کو ''وشنو'' دیوتا کی تجسیم خیال کیا جاتا ہے۔ یہ مچھلی کشتی کو بلند و بالا موجوں پر سے لے کر گزر گئی اور اسے شمال میں، ہسماوت پہاڑ پر لے آئی۔
ویلز: ویلش دیومالا کے مطابق (جن کا تعلق برطانیہ کے ایک کیلٹک علاقے ویلز سے ہے)، ڈوائنوین اور ڈوائفاخ ایک کشتی میں سوار ہو کر زبردست سیلاب میں زندہ بچ گئے تھے۔ ''موجوں کی جھیل'' کے نام سے مشہور لنلائن کے ابل پڑنے سے برپا ہونے والا یہ طوفان جب تھم گیا تو ڈوائنوین اور ڈوائفاخ نے برطانیہ کو نئے سرے سے آباد کرنا شروع کیا۔

اسکینڈینویا: نارڈک ایڈا دیومالاؤں میں برگالمیر اور اس کی بیوی کے ایک بڑی کشتی میں بیٹھ کر زبردست طوفان سے بچ نکلنے کا ذکر ہے۔

لتھوانا: یہاں کی قدیم داستان میں بھی یہ تذکرہ موجود ہے کہ انسانوں اور جانوروں کی چند جوڑوں کو ایک بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر، سائبان کے نیچے پناہ دے کر بچالیا گیا تھا۔

جب تند و تیز ہواؤں اور طوفانی موجوں کو چلتے ہوئے بارہ دن اور بارہ راتیں گزر گئیں تو پہاڑ کی چوٹی پر بھی پانی پہنچنے لگا اور قریب تھا کہ پہاڑی چوٹی کو بھی غرق کر دے۔ مگر اس موقع پر ''خالق'' نے ایک بہت بڑے اخروٹ کا چھلکا ان (لوگوں) پر پھینک دیا۔ اس طرح پہاڑ پر موجود لوگ، اخروٹ کے چھلکے میں سوار ہو گئے اور اس آفت سے زندہ بچنے میں کامیاب ہو گئے۔

چین: چینی ذرائع میں ''یاؤ'' نامی ایک شخص کا تذکرہ ہے جو زبردست طوفان اور زلزلے میں، سات دوسرے افراد یا ''فالی'' اور اپنی بیوی اور بچوں سمیت، کشتی میں سوار کر کے زندہ بچالیا گیا۔ اس داستان میں بتایا گیا ہے کہ ''ساری زمین تباہ برباد ہو چکی تھی۔ ہر طرف سے پانی ابل رہا تھا اور ہر جگہ پانی سے ڈھکی ہوئی تھی''۔ آخر کار یہ سارا پانی اتر گیا۔

یونانی دیومالا: دیوتا زیوس نے طوفان سے لوگوں کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ وہ دن بہ دن غلط کاریوں میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ صرف ڈیوکیلیئن اور اسکی بیوی پرپا کو طوفان سے بچایا گیا کیونکہ ڈیوکیلیئن کا باپ ''پرومیتھیئس'' پہلے ہی اپنے بیٹے کو ایک کشتی بنانے کا مشورہ دے چکا تھا۔ کشتی پر سوار ہونے کے بعد، نویں دن اس جوڑے کے قدموں نے پرناسوس پہاڑ پر زمین کو چھوا۔

اگرچہ یہ داستانیں مسخ شدہ ہیں مگر ان سے ایک ٹھوس تاریخی حقیقت کا اشارہ ملتا ہے۔ انسانی تاریخ میں ہر معاشرے تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا ہے، وحی سب لوگوں تک (کسی نہ کسی پیغمبر کے ذریعے) آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب طوفان نوحؑ کے بارے میں جان چکی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جیسے جیسے لوگ وحی میں دیئے گئے پیغام کی اصل بنیاد اور مقصد سے دور ہٹتے گئے، ویسے ویسے طوفان نوحؑ کا واقعہ بھی تحریف کی نذر ہوتا چلا گیا، اور آخر کار بے مقصد داستانوں اور دیومالاؤں میں بدل دیا گیا ہے۔

قرآن پاک ہی وہ واحد ماخذ ہے کہ جس سے ہمیں حضرت نوحؑ، اور انہیں جھٹلانے والی قوم کا صحیح قصہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ اکلوتی مقدس کتاب ہے جو کسی بھی قسم کی تحریف سے پاک ہے۔ قرآن پاک ہمیں صرف قوم نوحؑ یا طوفان نوحؑ کی درست معلومات ہی بہم نہیں پہنچاتا، بلکہ دیگر انبیائے کرام اور اقوام کی بابت صحیح تاریخی حقائق تک بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے.... تاکہ ہم انہیں جان کر عبرت حاصل کریں۔ (بشکریہ گلوبل سائنس)

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی بڑا جوش وخروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت وادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کرکے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

حقیقت وحدت الوجود

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔